لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

حصہ ہفتم

تخریج شدہ ایڈیشن

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس حصے کا موضوع بحث ''معاملات'' ہے، نیز اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت، عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظام حکومت، سلطنت اور ملکیت کی حقیقت جیسے متفرق مضامین و مباحث بھی شامل ہیں۔

تالیف
علامہ شبلی نعمانی
علامہ سید سلیمان ندوی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ---------- علامہ شبلی نعمانی ، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------------- اکتوبر 2012ء

قیمت ----------------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 37244973-042 فیکس: 37232369-042

بیسمنٹ سمت بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 2034256 ,041-2631204

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ۔

وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

سیرت النبی ﷺ اب بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں اور وہاں بولی جانے والی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاع گرانمایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح و توصیف کی اب ضرورت نہیں، بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر و عقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی و دیدہ وری کا ثبوت فراہم کرنے کے مرادف ہے:

مادح خورشید مداح خود است

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انہوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت علیہ الف الف صلوٰۃ کی سیرت طیبہ، حالات و واقعات اور شمائل و عادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدی ﷺ، تعلیمات نبوی اور شریعت اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے، انہوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلی کے قلم اعجاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے، دلائل و معجزات اور منصب نبوت (عقائد، عبادات اور اخلاق) کو بھی اپنی تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثتِ محمدی ﷺ اور سیرتِ نبوی ﷺ کی وسعت و جامعیت، اس کی بے خطا رہبری و رہنمائی اور ہر عہد میں حیات انسانی و نسل آدم کے لیے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لیے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ اور ذاتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات و سیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت و تعلیماتِ نبوی ﷺ پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ ان کی کتابِ زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے، لیکن انہوں نے

جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا (جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلہ سیرت النبی ﷺ کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور ذہنی کمالات وسعت نظر، جامعیت، اعتدال و توازن، احتیاط و تورع، شریعت اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی، قدیم و جدید کی واقفیت، دین کے اولین و مستند ترین ماخذ سے نہ صرف براہِ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اس میں شریعت اسلامی اور تعلیمات نبوی ﷺ کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور ترجمانی ہوتی، افراط و تفریط سے پاک تجدد و آزاد خیالی کے ہر شائبہ سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں ان صدہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصرِ حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنہ جواب رہتے ہیں، اس عہد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظیر گزشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیشِ نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگیز کام ہو جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیات مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی، قلم میں خطبات مدراس اور سیرت النبی ﷺ کی جلد سوم، چہارم، پنجم و ششم کا زور اور آبشار علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی، پھر بعض اسباب کی بنا پر دارالمصنفین کی وہ پرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا ہمہ وقت موقع اور فراغ خاطر باقی نہیں رہا تھا اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور ناہموار حالات اور صحت کی غیر مستقل و غیر معتدل کیفیت میں لکھا گیا، لیکن ایک مبصر و ماہرفن اور ایک استاد و کہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے اجمال میں سینکڑوں صفحات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصل مطالعہ ہوتا ہے، جس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔ عرصہ سے سیرت النبی ﷺ کے مے خانے کے مے خوار اور سید صاحب کی تحریرات و تحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لیے جو متفرق مضامین و مباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیورِ طبع سے آراستہ ہو جاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبی ﷺ کی چھ جلدوں کے قارئین و عشاق اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے قلب و نظر کو روشن کرتے، اللہ کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی

موقع ملا اور انہوں نے ان مضامین کو یک جا کر کے سیرۃ النبی ﷺ جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا، یہ حصہ اگر چہ (سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں) ضخامت میں بہت کم ہے، لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے، وسیع مطالعے کا نچوڑ اور فکر و نظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں میں نہیں ملیں گے، ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور تحریکوں کے قائد افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں اور انہوں نے مغربی و مادی فلسفوں کا اثر شعوری و غیر شعوری طریقے سے قبول کر لیا ہے، اس لیے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا، اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اٹھانے کی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا، اس لیے ان کو اس میں عرصہ تک تردد رہا، مقدمہ میں فرماتے ہیں:

> ''اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں، ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے۔ ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہو گا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے علما کی کتابیں نصاً اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے''۔ [1]

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

''اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بار ہا قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹانا پڑا چنانچہ کام کا آغاز ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا، لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا، اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم ہے۔'' [2]

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آ گئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لے جانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آ سکتی ہیں، مثلاً اس کتاب میں ''معاملات'' کی تعریف اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے ''میزان'' کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے۔ سید صاحب

---

[1] سیرۃ النبی ﷺ، جلد ۷، مقدمہ ص: ۵۔ [2] ایضاً، ص: ٦۔

کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے (جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی و انقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور وحدتِ مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکزِ ارشاد سے تعلق تھا، وہ نہ صرف سیاست وحکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا، بلکہ اس کو اصلاح و تربیت کے لیے بعض اوقات مضر سمجھتا تھا، ایسی صورت میں ان کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ نکلنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری ممیّزات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت وسلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب ونبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔'' ❶

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیات بینات جمع کر دیے ہیں اور یہ سیرت نبوی ﷺ کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتا ہے اور ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم و الدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:

> ''اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں، جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامِ سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد وایمان، شرائع واحکام اور حقوق وفرائض اس کے لیے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق وفرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہ اطمینان اور سکونِ خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل باآسانی کر سکیں، اس لیے وہ عرضاً مطلوب ہے''۔ ❷

اور اس کی تائید کے لیے وہ سورۂ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں، جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشرک کی شرط پوری کرتے ہوں، خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غرض اور نتیجہ دین مقبول کی پائیداری واستواری اور اس امن وامان کا قیام بیان کیا ہے، جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر چونکہ مذاہب سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو تفریقِ دین وسیاست کی قائل تھی اور اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح کہا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی ۔۔۔ سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں ۔۔۔ کہ وہ سر بلندی ہے یہ سر بزیری

---

❶ مقدمہ، ص: ۲۳۔ ❷ مقدمہ، ص: ٤٧۔

اس لیے خطباتِ مدراس اور رسولِ وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے کہ

''اسلام دین و دنیا اور جنتِ ارضی اور جنتِ سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح اللہ اور قیصر دو نہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے وہی زمین پر فرماں روا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۸۴)

''اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔'' [1]

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انہوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح خلافت اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیل ہوگئی ہے، نیز وہ موجودہ دور کے قیامِ حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں، اس لیے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

> ''اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول ہے، نہ غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکا اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔'' [2]

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے، اگر اس میں سیاسیات اور نظمِ حکومت کا پورا حصہ آ جاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین طریقے پر پُر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفوں کی سحر انگیزی اور اس کے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں ''نقشِ سلیمانی'' ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور ہوتا ہے۔

آثارِ قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگارِ نبوی، متکلمِ اسلام اور نابغہ عصر، استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق کتاب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی جلد پر یہ ہیچمدان پیش لفظ لکھے، لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے، اس لیے اس پر ایک ''ناقص'' کا کچھ لکھنا محلِ تعجب نہیں کہ

دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔ ۲۸ مئی ۱۹۸۰ء ابوالحسن علی ندوی [3] ۱۱ رجب ۱۴۰۰ھ

---

[1] مقدمہ، ص: ۴۹۔ [2] مقدمہ، ص:۔ [3] اس مضمون میں مقدمہ کے حوالہ سے جو صفحات نمبر دیے گئے ہیں وہ سابقہ ایڈیشن کے ہیں، اس ایڈیشن میں نمبر صفحات تبدیل ہوگئے ہیں۔

اظہار عجز

من و شبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی!
کہ محرم نیست خسرو راز ہاں در گفت گوئے تو

دار المصنفین اعظم گڑھ
۷ جولائی ۱۹۸۰ء، ۲۳ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ

ہیچمداں مور سلیمان
سید صباح الدین عبد الرحمٰن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى
سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهِ الطَّاهِرِيْنَ

مُقدّمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات

سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کے حدود

معاملات کا اطلاق فقہا نے حقوق عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے۔ مثلاً: بعض فقہائے شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے، یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور یا امور دنیا سے اس کا تعلق ہوگا تو ان کی تین قسمیں ہیں، اگر ان احکام شرعیہ سے جو امور دین کے متعلق ہیں، اشخاص کی بقا مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید وفروخت واجارہ ورہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقا مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح وطلاق وخلع وتفریق وغیرہ) اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقا ہے تو ان کو عقوبات کہیں گے۔ [1] (جیسے قصاص وسزا وتعزیرات وغیرہ)

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی، جن پر دین ودنیا کی مصلحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین ودنیا میں فساد راہ پائے گا اور انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، یہ قسمیں کی ہیں:

عبادات جیسے نماز روزہ وغیرہ اور عادات جیسے ماکولات، مشروبات، ملبوسات اور مسکونات کے احکام اور تیسری چیز معاملات ہے، جس سے مقصود نسل ونفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی چیز جنایات ہے جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجرا اس شخص پر ہوگا جو احکام بالا کو توڑے (جیسے قصاص وحدود وتعزیرات)۔

فقہائے احناف میں سے علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے بحر الرائق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، مزاجر اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ ابواب پر منقسم ہے، معاوضات مالیہ (بیع وفروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح وطلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات (وراثت) اور مزاجر، یعنی جن کاموں پر شریعت

[1] کشاف، اصطلاحات الفنون، احمد تھانوی، مطبوعہ کلکتہ، ج۱، ص: ۲۳ بحوالہ توضیح وتلویح۔

نے زجر کیا ہے اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں، قتلِ نفس پر زجر، کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر، کسی کی آبرو ریزی پر زجر، کسی کی پردہ دری پر زجر، قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

معاملات سے ہماری مراد

لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے، یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکامِ شرعیہ ہیں، جن کا تعلق ان تمام حقوقِ عباد سے ہے، جن کی حیثیت قانون کی ہے، جن میں معاملات اور مزاجر دونوں داخل ہیں اور جن کا منشا جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی، یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔ آبادی و مملکت جن کا قانونی نام مدینہ ہے، اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے۔ لیکن ہمارے قدیم فقہا نے اس کے لیے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمد، اس میں امارت و خلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آجاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے، جیسے احکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۴۵۰ھ اور احکام السلطانیہ قاضی ابویعلیٰ حنبلی المتوفی ۴۵۸ھ، لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ و خراج و زکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں اور اسی لیے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال، یا کتاب الخراج رکھا ہے، جیسے کتاب الاموال ابوعبید بن سلاّم المتوفی ۲۲۴ھ اور کتاب الخراج قاضی ابویوسف المتوفی ۱۸۲ھ اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم القرشی المتوفی ۲۰۳ھ، اہل سنت کے نزدیک گو امامت اصول عقائد میں سے نہیں ہے، تاہم اس کے ضروری مباحث کتب عقائد کے خاتمہ میں ذکر کر دیے جاتے ہیں، جن میں امامت کے شرائط اور طریق انتخاب، اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرزِ بیان سے بالکل مختلف ہوگا اور ان کے لیے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی، اس لیے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی و بیشی اور مباحث میں رد و بدل اور نئی ضرورتوں کے لیے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں، جن کا تعلق معاشرت مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے، جن سے دو یا دو سے زیادہ افراد پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو اور ان ضابطوں اور قانون کی تفصیل ہو۔ ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہوسکتی ہیں: معاشریات، اقتصادیات اور سیاسیات اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت

سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے، معاشریات میں نکاح وطلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی، اقتصادیات میں تمام مالی وتجارتی کاروبار کا بیان آجائے گا اور سیاسیات میں حکومت وسلطنت اور اس کے متعلقات مذکور ہوں گے۔

اس کام کا اشکال

یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے، جن میں یہ احکام مذکور ہیں اور فقہا نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے، اس لیے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا، مگر موجودہ زمانے میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا، جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات واقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدما کی کتابیں نصًا اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لیا جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے، مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ کے سیاسیات کے احکام وفرائض کا ماخذ خود ذاتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور انور ﷺ کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے، جس سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بار ہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز گو ۷ جمادی الثانیہ ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیے، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کر لیا اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴/ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا۔ لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا۔ اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔ ﴿ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ ۲۵ تا ۲۸)

دیگر مذاہب اور معاملات

دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کیے ہیں، تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزو ہے لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہندوستانی مذہبوں میں بھی دونوں قسمیں نظر آتی ہیں، عام ہندوؤں میں منوشاستر اور اس کی مختلف تشریحیں انہی معاملات کی شاخیں ہیں، مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے، تاہم یہ سب قومیں

اپنے قانون کا ماخذ علمِ الٰہی اور علمِ مافوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔

معاملات کے ماخذ

دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنھوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحی الٰہی کے بجائے عقلِ انسانی پر رکھی ہے اور انسانی تجربہ وقیاس کو اپنے قانون کی اساس بنایا ہے اور کہیں صرف سردار یا بادشاہ کی شخصی خواہش اور میلانِ طبع قانون کا معیار ہے، کہیں شخص نے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور افراد کی کثرت اور قلت اور کسی طرف رائے دینے والوں کی تعداد کی کمی اور بیشی کو صحت اور غلطی، صواب اور خطا اور حق و باطل کا معیار بنایا گیا ہے، یہ افراد و ارکان مختلف اداروں سے چنے جاتے ہیں اور مختلف فرقوں سے منتخب ہوتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ذاتی ہوا و ہوس نہ ہو تو بھی فرقہ وارانہ ہوا و ہوس اور جماعتی تعصب اور فرقوں کا نفع و نقصان قوانینِ جمہور کی بنیاد قرار پاتا ہے اور جمہوریت کے لباس میں شخصیت اور فرقہ واریت صرف اپنے نفع کی خاطر جمہوریت پر حکم نافذ کرتی ہے اور جمہور کو اس کا پابند بناتی ہے۔

قانون سازوں کی بیچارگی

اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرق بیچ میں حائل ہے تو جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی قوم اور غیر قوم، امیر و غریب، سرمایہ دار اور مزدور، تجارت پیشہ اور زمیندار طبقہ اور غیر طبقہ، پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں حجابات اور دیواریں حائل ہیں، جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹانا آسان نہیں، جب کوئی تجویز معرضِ بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطہ نظر سے نہیں، بلکہ ملک، قوم، جماعت، طبقہ اور پارٹی کے نقطہ نگاہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کو جمہور کے لیے آیۂ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی

اس جوش و خروش اور قوت اور دلیل سے جو تجویز آیۂ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے، اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ بیک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے، پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے، اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی، آخر وہ بھی فنا ہو جاتی ہے اور تیسری اور چوتھی اور پانچویں آتی ہے اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے، ان تمام تغیرات کی تہ میں جو ہاتھ کام کرتا ہے وہ قومی و جماعتی اور شخصی مفاد کا ادل بدل اور تغیر ہے، ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے یا ایک کو پہنچتا ہے دوسرے کو نہیں، تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے اور یوں ہی پوری عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گزر جاتی ہے اور جمہور کو طمانیت کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

صحیح و عادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری

ان تغیرات کے باوجود جو قانون بنتا ہے، چونکہ وہ صرف ظاہری طاقت پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے اس کے

چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا، اس لیے قدم قدم پر اس کے چلانے والوں کے ذاتی مفاد سے ٹکراتا ہے اور بارہا وہ حرص وطمع، غرور تکبر، ہوا و ہوس، رشوت اور انتفاعِ ناجائز وخوف و ہراس اور مکر وحیلہ کے بیسیوں خلافِ انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل وانصاف کی میزان ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

قانونِ الٰہی کی ضرورت

اسی سبب سے مصلحت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل وانصاف کی یہ میزان خود دستِ الٰہی میں ہو، وہ جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں، کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں، وہ سب کا ہے اور سب کے لیے ہے اور تمام نفسانی اغراض سے پاک و بے نیاز ہے، جس کو اپنے لیے اور اپنی غرض کے لیے کچھ نہیں چاہیے، جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک اس نے اپنا تکوینی فرمان جس کو قانون طبعی کہتے ہیں، جاری کر رکھا ہے، اسی طرح زمین پر اپنا تشریعی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں، جاری فرمائے، جو تمام تر عدل وانصاف پر مبنی ہے۔

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۱۷)

''وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کے ساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری۔''

﴿ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۵)

''اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔''

کتاب اور میزان

میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں، بلکہ فطرت اور عدل وانصاف اور حق کی میزان ہے جس سے سارا نظام کائنات تل رہا ہے اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں، چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

﴿ اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۭ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ۝ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ ۙ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ۝ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۝ ﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۱۔۹)

''رحمت والا اللہ جس نے قرآن سکھایا، انسان کو بنایا اور اس کو گویائی سکھائی، سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اس کے زیر فرمان ہیں اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے ترازو (میزان) رکھ دی، تاکہ تول میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔''

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے، اس لیے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب، ماہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ یہ قصد و ارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد و ارادہ کے بغیر کس طرح عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام و اصول کے مطابق چل رہی ہیں، اسی طرح قصد و ارادہ کی دولت و نعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہیے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصد و ارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکامِ عدل کی پیروی اختیار کرے، قرآن پاک میں بار بار ہے:

﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٢)

''اور ناپ اور تول کو پورا کرتے رہو۔''

﴿ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (٧/ الاعراف:٨٥)

''تو ناپ اور تول کو پورا رکھو۔''

﴿ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (١١/ هود:٨٥)

''ناپ اور تول کو پورا کرو۔''

﴿ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (١١/ هود:٨٤)

''ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔''

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید و فروخت کی اشیاء بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجیے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں، [1] ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لیے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لیے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لیے دوسری ترازو سے اس ستم پیشہ پر اللہ کی اور ساری دنیا کی پھٹکار۔

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ ﴾ (٨٣/ المطففين: ١-٣)

''پھٹکار ہے ان کم کردینے والوں پر جو اپنے لیے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔''

معاملات انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے، چنانچہ سورۂ حدید میں زمین میں قیامِ عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں:

[1] تفسیر طبری میں آیات میزان سورۂ حدید، ج ٢٧، ص: ١٢٢، اور سورۂ رحمٰن، ج ٢٧، ص: ٦٢، ٦٣۔

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۵)

''اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے کئی فائدے ہیں۔''

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لیے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک کتاب، یعنی احکامِ الٰہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری صحیح وعادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دنوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے، یعنی جو احکامِ الٰہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت وریاست ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں قانونِ الٰہی کی کتاب بھی ہونی چاہیے جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔

قانون الٰہی کی دائمی یکسانی

قانون الٰہی کے نظریہ پر ایک شبہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لیے انسانی معاشرت کے خاکے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے، اس لیے قانون کو بھی بدلتا رہنا چاہیے، مگر یہ خیال سراسر فریب ہے، کیونکہ شے نہیں بدلتی، اس کے رنگ، شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں۔ جس طرح مادیات کے اصول طبعی کبھی نہیں بدلتے (الا ماشاء اللہ) گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے اور ٹھنڈی، ٹھنڈی۔ آگ برف نہیں بنتی، برف آگ نہیں، روشنی تاریکی نہیں، تاریکی روشنی نہیں، زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے، رات اور دن پے درپے آتے اور جاتے رہتے ہیں، گھنٹے گھڑی، پلک اور لمحے دم بدم بدل رہے ہیں، سال پر سال آتے ہیں مگر چاند اور سورج وہی ہیں، ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں، جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب وگل کی دنیا پر حکمران تھا، آج بھی وہی ہے، اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کر سکی، نہ چودہویں صدی، پہلے بھی سال کے بارہ شمسی یا قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں، کل بھی دن رات کے چوبیس گھنٹے تھے اور اب بھی ہیں۔ یعنی اللہ کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۳)

''اللہ کے قانون میں تو کوئی ادل بدل نہ پائے گا۔''

فطری حقوق ومعاملات کی یکسانی

ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی ومعاشرتی قوانین اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں ان میں نہ

کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا۔ نیکی بدی نہیں بنتی ، بدی نیکی نہیں ، سچ جھوٹ نہیں ہو جاتا، جھوٹ سچ نہیں، ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا، دوسروں کی چیز ناحق لینا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، دوسروں کی عزت و آبرو کو داغ لگانا، دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا۔ حقِ قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا، کسی کی جائیداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور رہے گا، لین دین میں طرفین کی رضا مندی، لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام، اخلاق سوز حرکات کی بندش، فتنہ وفساد کا انسداد، ظالمانہ طریقوں کی ممانعت، ہر عہد میں، ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے، جب کبھی کوئی قانون بنا ہے، یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزا، رہے ہیں اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس کے یہ اجزا برقرار رہیں گے۔ البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لیے قانونِ الٰہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام سے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بنتے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تخیل

ہر مجموعہ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے، جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جزو کی بنیاد ہوتی ہے، یہ بنیاد کہیں قومی فوقیت، کہیں وطنی افادیت، کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے، اس لیے اس مجموعہ قانون میں اسی بنیادی نقطۂ غرض کی لکیریں ابھری نظر آتی ہیں، جہاں قانون کی بنیاد قومی فوقیت ہے، وہاں کالے گورے، یورپین اور نیٹو کے اصول پر کارفرمائی ہے، جہاں وطن قانون کی اساس ہے، وہاں جغرافی اقطاع ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں اور رومی اور غیر رومی، یونانی اور غیر یونانی، مصری اور غیر مصری، ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دیے ہیں، یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ وار اختلاف کا بیج بوتا ہے، ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں اور بنگالی پنجاب میں بیگانہ ہے، بہاری یوپی میں جگہ نہیں پا سکتا اور یوپی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے، فیشزم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور موجودہ امپیریلزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانونِ الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت

اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اطاعت کے لیے زمین سے فتنہ وفساد کا دفع، اس کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع وفریب کی روک تھام ہے۔ [1] چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنے حدود وتعزیرات ہیں ان کا مقصد زمین سے فتنہ وفساد کا دفع ہے اور جس قدر معاملات و معاشرت کے اصول اور مسائل ہیں، ان کا مبنیٰ

---

[1] علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری المتوفی ۶۶۰ھ کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب معاملات ملاحظہ ہوں۔

بندوں کے درمیان عدل وانصاف اور امن واطمینان کا قیام ہے اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں، ان سب کا منشا باہمی نزاع اور خدع وفریب کا استیصال ہے۔

اس اوپر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف، زبان اور لغت اور تہذیب وتمدن کا کوئی فرق اور ملک واقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے، یہ قانون اللہ کا ہے، اللہ کے سارے بندوں کے لیے بنایا گیا ہے، وہ چاہے کالے ہوں یا گورے، آریائی ہوں یا سامی، یورپی ہوں یا ایشیائی، ہندی ہوں یا حجازی، عجمی ہوں یا تاتاری، سب کے لیے یکساں اور سب کے لیے برابر ہیں۔

ایک اصولی فرق

بے شبہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہوگی جو اس کے اس قانون کو قانونِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں، اس بنا پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں: ایک وہ جو اس قانون کو قانونِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اللہ واحد وبرحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں، مسلمان ہیں۔ دوسرے وہ جو گو اس خاص قانون الٰہی کو نہیں مانتے، لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانون الٰہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر محفوظ صورت میں اس وقت ہو، مانتے ہیں، ان کا نام ذمی ہے، لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے پاس مانا ہوا قانونِ الٰہی اب بھی ان کے مانے ہوئے صحیفہ الٰہی کے ضمن میں موجود ہے، یہ کتابی ہیں اور دوم وہ جو اپنے قانونِ الٰہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں، یہ شبہ کتابی ہیں۔ چوتھے وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفہ الٰہی سے ناآشنا اور ہر قانون الٰہی سے محروم ہیں، ان کو مشرک کہتے ہیں۔ اسلامی قانونِ الٰہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبہ بعض امتیازات ہیں، جن کی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالاً یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ معاملات کے حدود کیا ہیں اور اس کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں، تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔

باہم انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کے برقرار اور امور معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لیے ایک عاملانہ طاقت وقوت کا وجود ضروری ہے، جو ہر چیز کو احکام شرع اور نظامِ عدل کے مطابق قائم رکھے، اس بحث کے دو ضروری جزو ہیں۔

1. اس عاملانہ طاقت وقوت کی ضرورت، حقیقت، اس کے شرائط واوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔
2. معاملاتِ انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علیحدہ علیحدہ احکام اور اس کے اسرار ومصالح۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت

محمد رسول اللہ ﷺ دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ ﷺ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوش خبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تاکہ دنیا میں اللہ کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف وخطر کی جا سکے اور اس کے لیے اللہ کی بادشاہی اللہ کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ ﴾ (۲۴/ النور:۵۵)

''اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا، جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا، جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے، جما دے گا اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بدلے امن دے گا، میری بندگی کریں گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔''

اور اس کے لیے اللہ کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے، تاکہ سارا حکم اسی ایک اللہ کا ہو جائے:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ ﴾ (۸/ الانفال:۳۹)

''اور ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فساد نہ رہے اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔''

قرآن نے اللہ کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے:

﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۱)

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔''

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے، علم وعبادت، تندرستی روزی، مال ودولت، فتح ونصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تحدید ہے، دنیا کی بھلائی وہ ہے جو اللہ کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝ۙ ﴾

(۱۶/ النحل:۳۰)

''اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے۔''

مقصود یہ ہے کہ نیکوکاروں کے لیے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی، ان کو بشارت ہے:

﴿ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

(۳/ آل عمران :۱٤۸)

''تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔''

دنیا کا ثواب فتح ونصرت، ناموری وعزت، مال ودولت اور حکومت وسلطنت ہے۔

جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، اللہ نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ﴾ (۱٦/ النحل :٤۱)

''اور جنہوں نے گھر چھوڑا اللہ کے لیے ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔''

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت وحکومت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی:

﴿ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ (۷/ الاعراف:۱٥٦)

''اور (اے خدا) ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔''

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائیدار ہے، اس لیے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ ضمنی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو، ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تو دنیا تو مل جائے گی، مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ڮ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (۱۱/ ہود:۱٥۔۱٦)

''جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے

ہیں اور کمی نہیں کی جاتی، یہ وہ ہیں جن کے لیے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔''

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۲۰)

''جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔''

﴿ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران : ۱۴۵)

''جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور شکر گزاروں کو ہم پورا اجر دیں گے۔''

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآءیل:۱۸۔۱۹)

''جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دے دیتے ہیں جس کو جو چاہتے ہیں، پھر ہم نے اس کے لیے دوزخ کو بنایا ہے، وہ اس میں داخل ہوگا برا ہو کر، دھکیلا جا کر اور جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری کوشش کرے اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔''

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ ﴾ (۴/ النسآء:۱۳۴)

''تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو (اس کو معلوم ہو) کہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے۔''

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ اللہ کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے، وہ آخرت سے محروم ہے، لیکن جو آخرت کا طلب گار ہے، اس کے لیے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کو مل جائے گی، مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لیے بند ہو جائے گا۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے:

﴿ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء : ٥٤)

”تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی اور بڑی سلطنت بخشی ۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

﴿ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ﴾

(٥/ المآئدۃ:٢٠)

”اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے، حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے زمانہ میں پوری ہوئی، طالوت کی نسبت خبر دی گئی:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٤٧)

”بے شبہ اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔“

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (٢/ البقرۃ :٢٤٧)

”اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دے دے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا:

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ ﴾ (٣٨/ صٓ :٢٦)

”اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی:

﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ﴾ (٣٨/ صٓ:٣٥)

”اے میرے پروردگار! میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایان نہ ہو۔“

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے:

﴿ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ﴾

(٣/ آل عمران:٢٦)

''اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔''

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بنا دیا ہے:

﴿ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۝ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ۝ ﴾

(۲۱/ الانبیاء:۱۰۵۔۱۰۶)

''بے شک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں۔ اس اعلان میں اللہ کے فرمانبردار لوگوں کے لیے پیام ہے۔''

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۝ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۝ ﴾

(۲۲/ الحج:۴۰۔۴۱)

''اور البتہ اللہ اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے، وہ کہ اگر ہم ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوۃ دیں، اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔''

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا، وہ پہلے خود اچھا ہوگا اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا۔

اللہ کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں، اللہ ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اللہ کے قانون کے اجرا کی طاقت ہونی چاہیے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود وتعزیرات اسی منشا کے مطابق ہیں۔ زنا کی حد میں فرمایا:

﴿ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ﴾

(۲۴/ النور:۲)

''اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔''

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لیے تیار ہونا چاہیے:

﴿ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۹)

''تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے لڑنے کے لیے خبردار ہو جاؤ۔''

اس لیے نجران کے عیسائیوں سے آپ ﷺ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ [1] جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں، ڈاکہ ڈالیں لوٹ مار کریں، قرآن اس کو اللہ اور رسول سے لڑنا کہتا ہے اور اس کی سزا قتل، پھانسی، قطعِ ید اور قید یا جلاوطنی ہے اور ان کی اس بے کسی و بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہا ہے:

﴿ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۳)

''یہ ان کے لیے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی:

﴿ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۲۸)

''اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین تو اللہ کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔''

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، الٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا:

﴿ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۲۹)

''قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔''

آخر جب وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام اور بے کس قوم خلافتِ الٰہی کے تاج سے سرفراز ہوئی:

﴿ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۳۷)

''اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور پچھم کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت دی ہے اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے۔''

[1] ابوداود، کتاب الخراج والفيء والامارة، باب في اخذ الجزية: ۳۰۴۱۔

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی، لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منہ پھیرنے لگے، تو دفعتہً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشین گوئی فرمائی:

﴿ وَقَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ فِى ٱلْكِتَٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى ٱلْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولَىٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُو۟لِى بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا۟ خِلَٰلَ ٱلدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ ٱلْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَٰكُم بِأَمْوَٰلٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝ إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ ٱلْءَاخِرَةِ لِيَسُۥٓـُٔوا۟ وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا۟ ٱلْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا۟ مَا عَلَوْا۟ تَتْبِيرًا ۝ ﴾

(١٧/ بنی اسرآءیل :٤-٧)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبر دار کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا، تو وہ ملک میں گھس گئے اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے، پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا اور تم کو مال اور اولاد سے مدد کی اور تمہاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے لیے اور برا کرو گے تو اپنا، پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا، تاکہ تمہارے منہ بگاڑ دیں اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں، جیسے (تمہارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔''

اہل خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کیے گئے ہیں، وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لیے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انہیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی اللہ کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی اللہ کا وہی برتاؤ ہوگا۔ اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انہیں پہلے ہی ہوشیار کر دیا گیا تھا کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکام الٰہی کی پیروی کی جائے۔ جب تم ان سے منہ پھیرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی، چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ دونوں موقعے پیش آئے اور دو دفعہ ان کی شامتِ اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل و محکوم ہونا پڑا۔ ایک بابل کے بادشاہ بنوکدنذر معروف بہ بخت نصر کے ہاتھوں اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا، ظالم بادشاہ کے پنجوں میں گرفتار ہونا اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا سبب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی، چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا:

﴿ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل:۸۔۹)

''امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے، تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے، یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں، بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے اجر عظیم ہے۔''

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی ﷺ پر ایمان لائیں، لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الٰہی بھی دور ہوگئی، کیونکہ انہیں سنا دیا گیا:

﴿ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۰)

''تم میرا وعدہ پورا کرو تو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا۔''

بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی میثاق الٰہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے:

﴿ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۫ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ ۫ تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ ﴾

(۲/ البقرۃ:۸۳۔۸۵)

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا، تو چند شخصوں کے سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھیر بیٹھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا اور اپنے کو ان کے وطن سے نہ نکالنا، تو تم نے اقرار کر لیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو، پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں وطن سے نکال بھی

دیتے ہو، اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو، حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا (یہ) کیا (بات) کہ تم کتاب (اللہ) کے بعض احکام کو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔''

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لیے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہمیشہ کے لیے بھلا دیا اور فرمایا:

﴿ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۵)

''تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیے جائیں۔''

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ سزا سنائی گئی:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۱۴)

''اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے، جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو، ان لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں، مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔''

جو لوگ اللہ اور رسول ﷺ سے لڑتے ہوں اور اللہ کی زمین میں فساد اور غارت گری پھیلاتے ہوں، ان کے لیے دنیا کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے، ان کو سولیوں پر لٹکایا جائے، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں، ان کو ملک سے باہر قید کر دیا جائے:

﴿ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۳)

''یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے۔''

یہود کے رئیسوں اور عالموں کو جنہوں نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنا لیا تھا، یہ سزا سنا دی گئی:

﴿ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۱)

''دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔''

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنا پر دین میں کج بحثی کرتے

ہیں اور دنیاوی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے منہ پھیرتے ہیں، ان کے لیے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍۙ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾

(۲۲/ الحج:۷۔۹)

''اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی شان میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے، تا کہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے گمراہ کر دے، اس کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور قیامت کے دن ہم اسے عذاب (آتش سوزاں) کا مزہ چکھائیں گے۔''

یہود نے جب گائے کے بچھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسیٰ علیہ السلام کو وحی الٰہی نے خبردار کر دیا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۲)

''(اللہ نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا لیا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) اور ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔''

یہی نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لیے ذلت، قومی مسکنت اور غضبِ الٰہی کے مستوجب ٹھہرائے گئے، کیونکہ انہوں نے احکامِ الٰہی سے انحراف کیا، اللہ کے رسولوں کو قتل کرتے اور حدودِ الٰہی کو توڑتے رہے:

﴿ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۶۱)

''اور (آخرکار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے، یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔''

آخر الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لیے مہلت کا آخری موقع تھا، لیکن ان کی سرکشی بدستور قائم رہی، اس پر اللہ نے قیامت تک کے لیے ذلت و مسکنت اور غیروں کی غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی:

﴿ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۱۲)

''یہ جہاں نظر آئیں گے، ذلت (کو دیکھو گے کہ) ان سے چمٹ رہی ہے، بجز اس کے کہ یہ اللہ اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آ جائیں اور یہ لوگ اللہ کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے، یہ اس لیے کہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے (اور اس کے) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے یہ اس لیے کہ یہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔''

دوسری سورہ میں ہے:

﴿ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۶۷)

''اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے اشخاص کو مسلط رکھے گا جو ان کو بری بری تکلیفیں دیتے رہیں، بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔''

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے، تاریخ کا کون سا دور ہے، جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انہوں نے اپنے کیے کی سزا نہیں پائی ہے اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب، ذلت، نکبت اور مسکنت کی تفسیر جزیہ سے، یعنی ان کی دائمی محکومی اور غلامی سے کی ہے، قرآن پاک کی دعا میں ہے:

﴿ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ﴾ (۳/ آل عمران:۲۶)

''اے اللہ! سلطنت کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔ تیرے ہاتھ میں سارا خیر ہے۔''

ان آیتوں میں لف ونشر مرتب ہے، یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوگا اس کا تعلق یہود کی نسل وقومیت سے نہیں، بلکہ ان کے افعال وکردار سے ہے، احکام الٰہی سے انحراف، انبیا ومصلحین امت کا قتل

وتکذیب، حرص وطمع، سودخواری اور تمام دیگر ذمائم وقبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں، وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ زمین کی وراثت اور اللہ کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے گئے، پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۲)

''(اللہ نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا تھا، ان پر پروردگار کا غضب واقع ہو گا اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔''

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچہ کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر اس مفتری کے لیے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جبہ سائی کرے گا اور ارض وسما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش وطلب میں دربدر پھرے گا، مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئے گا:

﴿ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۸)

''اور جس کو (اس کے اعمال کے پاداش میں) اللہ رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔''

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت ۔۔۔ بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے، اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بہ دل وجان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت وبرکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل وجان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شرع میں ایمان اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینہ برستا اور فتوحات کا چشمہ ابلتا ہے، اللہ نے یہود ونصاریٰ سے خطاب کر کے فرمایا:

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۶۵۔۶۶)

''اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات وانجیل کو اور جو (اور کتابیں) ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں، ان کو قائم رکھتے تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا

کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔‘‘

لیکن افسوس کہ انہوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا، تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی:

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۹۶)

’’اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے، مگر انہوں نے تو تکذیب کی، سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔‘‘

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ (۲۴/ النور:۵۵)

’’جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔‘‘

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۰)

’’اللہ نے تم سے بہت سے غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، سو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی۔‘‘

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لیے ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ ﴾ (۶۱/ الصف:۱۰۔۱۳)

’’مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے (وہ یہ کہ) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو، اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغ ہائے جنت میں جن میں

نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشت ہائے جاودانی میں (تیار) ہیں، داخل کرے گا، یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے (یعنی تمہیں) اللہ کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی اور مومنوں کو اس کی خوش خبری سنا دو۔''

یہ فتح ونصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دینِ الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾

(۹/ التوبۃ:۳۳)

''وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا، تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔''

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورۂ فتح وسورۂ صف میں دہرائی گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ توبہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورۂ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے۔ یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آیندہ پوری ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی دلجمعی اور اطمینان کا باعث ہے، لیکن اس کے پورے ہونے کے لیے مسلمانوں پر سعی وکوشش بھی فرض ہے، بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو مخبر صادق علیہ السلام کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لیے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی، جیسا کہ سورۂ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ (۸/ الانفال:۳۹)

''اور لوگوں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔''

سارا حکم اللہ کے لیے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی وجسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے، جس کی بھی اطاعت ہو وہ اللہ کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح ونصرت اور حصولِ غنیمت کی بشارت دی گئی ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ ....

﴿ وَّاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ۝ ﴾

(۴۸/ الفتح:۱۸۔۲۰، ۲۱)

’’(اے پیغمبر ﷺ!) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا اور جو صدق وخلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا، تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی، بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں اور اللہ غالب حکمت والا ہے، اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، تو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی...... اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے اور وہ اللہ ہی کی قدرت میں تھیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

یہ فتح وغنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے، وہ خیبر کی فتح ہے، جو بیعت رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے، وہ مکہ کی فتح ہے، چنانچہ اسی سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوش خبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی:

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ ﴾ (۴۸/ الفتح:۱)

’’(اے محمد ﷺ!) ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف۔‘‘

آنحضرت ﷺ جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس فتح ونصرت کے وعدے کے پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا:

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ ﴾ (۱۱۰/ النصر:۱۔۳)

’’جب اللہ کی مدد اور فتح آ چکی اور تم نے دیکھا کہ لوگ اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت چاہو۔‘‘

اسلام کی دعوت، شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، طاعات اور عبادات کی دعوت، فرائض وحقوق کی ادائی، قلوب ونفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم وتربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہنچتی گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہنچ گئی اس موقع پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں، جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد وایمان، شرائع واحکام اور حقوق وفرائض اس کے لیے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو

کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل باآسانی کر سکیں، اس لیے وہ عرضاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ ﴾ (۲۴/ النور:۵۵)

’’جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔‘‘

اس آیت میں خلافت کے عطا، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو، اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادتِ الٰہی کی تعلیم اور ردِ شرک کی دعوت اس لیے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے۔ اس کی مسجد اس کا دیوان، اس کا منبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگ جو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ ﷺ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی، ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں، لیکن آپ ﷺ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ [1] کیونکہ آپ ﷺ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ ﷺ کی انسانی پادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر اللہ واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا، اسی لیے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح اللہ اور قیصر دو نہیں ہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے اور وہی زمین پر فرماں رواں ہے۔

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَاۗءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۸۴)

[1] سیرۃ ابن ہشام وفد روسائے قریش کی گفتگو، ص:۱۸۰، ۱۸۱ مطبوعہ محمد علی صبیح مصر۔

”اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔“

وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لیے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی اللہ کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیوی ہوگی، نہ دیوتا ہوگا اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ، جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا، اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لیے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا، سورۂ مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورہ ہے، [1] مسلمانوں کو ہوشیار کیا جاتا ہے:

﴿ وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۖ﴾ (۷۳/ المزمل: ۲۰)

”(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی تلاش میں اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔“

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانے میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ و سنان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی، گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سر بکف میدان میں آنا ہوگا۔

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کی، سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لیے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضور ﷺ نے سورۂ فصلت کی آیتیں پڑھیں، جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آ گیا اور واپس آکر قریش سے کہا کہ اللہ کی قسم! محمد ﷺ جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ شاعری ہے، نہ جادو ہے اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لیے تم محمد ﷺ کو اپنا کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ گئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے، تمہیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد ﷺ نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا، اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر

[1] بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اول و آخر میں ایک سال کا فصل ہے، صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین، باب جامع صلوۃ اللیل: ۱۷۳۹ وبیهقی وحاکم واحمد۔

دیا۔ کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کی:

''اے محمد (ﷺ)! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو، جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے۔ تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو، ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو، تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا، تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے۔''

یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں، مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہیے، نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے، مجھے تو اللہ نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے اللہ سے حکم ملا ہے کہ اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں، اگر تم اس کو مان لو گے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کا فیصلہ آ جائے۔'' ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ وغسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان وشوکت کی بادشاہی نہ تھی، جو صلح وآشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی، اس لیے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاح عالم کا اخلاقی وسیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا، جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آ جاتی تھی اور اسی لیے اس کے لیے عرب وعجم بلکہ جن وبشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔ قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابو طالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد ﷺ سے صلح ہو جائے، ابو طالب بھتیجے سے کہتے تھے: جان عم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں، وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں اور وہ کچھ تم کو دینا چاہتے ہیں، ارشاد ہوا: ''اے عم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہو جائیں گے اور عجم ان کے زیر نگیں ہوگا۔'' ابو جہل نے کہا: ہم آپ (ﷺ) کی ایک بات نہیں دس باتیں مانیں گے، ارشاد فرمایا کہ ''یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں اور اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔'' [1] حج کے موسم میں آنحضرت ﷺ عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر توحید کی

[1] سیرۃ ابن ھشام، ج۱، ص:۲۵۲۔

دعوت دیتے ہیں اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں: ''اے لوگو! کہو کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں، تم فلاح پاؤ گے، عرب تمہاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمہارے تابع فرمان ہوگا اور تم جنت میں بادشاہ بنو گے۔'' [1]

بیعتِ عقبہ میں جب مکہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسول انام ﷺ کے دست مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے، بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے، اسعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ ﷺ سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لیے لڑنے کو تیار رہو؟ سب نے کہا: ہاں۔ انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ ﷺ اپنی شرطیں پیش فرمائیں، ارشاد ہوا: ''اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز کھڑی کرو گے، زکوۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہوگا اس کو اس سے چھیننے کے لیے جھگڑا نہ کرو گے اور جس سے تم اپنی اور اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہو، میری بھی کرو گے۔'' انصار نے ایک آواز سے کہا، ہاں! یا رسول اللہ! آپ ﷺ کی یہ سب باتیں منظور، لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا: ''جنت اور فتح و نصرت۔'' [2]

یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمۂ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی اور آخر تلوار کو تلوار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے لیے عرب و عجم بلکہ جن و بشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا، یہاں تک کہ اللہ کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی، مختلف موقعوں پر صحابہ رضی اللہ عنہم کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوش خبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوۂ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے، حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں، دم بہ دم خبریں آ رہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈتا چلا آ رہا ہے، آنحضرت ﷺ اور جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم بھوکے پیاسے

---

[1] طبقات ابن سعد، ج۱، ص: ۱۴۵، لائیڈن۔

[2] طبقات ابن سعد، جزء ثالث بدر یین قسم ثانی، ص: ۱۳۹ لائیڈن۔

مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آجاتا ہے، جس کو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہورہی ہیں، حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہوجاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری نکلتی ہے جس کی روشنی میں پہلے کسریٰ کے شہر، پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں اور حضور ﷺ ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں، اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہوسکتا تھا کہ یہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ دیں گے، لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ ''مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے۔ مداین تمہارے ہاتھ آئے گا، قیصر وکسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مصر کا تخت تم کو ملے گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے، جنگ ہوگی، ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدان جہاد اور بحرِ روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی۔'' [1]

لیکن ان خوش خبریوں، بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہیے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی، یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں، یہ اس لیے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے مواقع کو دور کرنے میں معین ہیں اور اسلام کے حدود اور قانون عدل وانصاف کے اجرا کے ذریعے ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت وطاقت، شان وشوکت اور مال ودولت کو صرف اللہ کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے، اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش وعشرت، یہ دولت وحشمت اور جاہ ومال، سوئے مآل کا موجب ہوجائے گا، اسی لیے ضروری ہے کہ کروفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت وحشمت اور مال ودولت دنیا کی نہیں، بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لیے ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہ کھیتی دنیا کے لیے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لیے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لیے فوز وفلاح کا موجب ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝﴾ (٤٢/ الشوریٰ: ٢٠)

''جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا

[1] ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبی ﷺ جلد سوم میں پیشین گوئیوں کے بیان میں ہیں۔

خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔''

﴿ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:١٤٤)

''اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو، اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔''

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہوشیار کیا گیا ہے کہ دولتِ فانی کے پیچھے دولتِ باقی کو مت بھولو، کیونکہ یہاں کی لذت، عیش و عشرت، آرام و راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ، ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ ﴾ (١٦/ النحل:٤١)

''اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد اللہ کے لیے وطن چھوڑا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔''

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:

﴿ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ ﴾

(٩/ التوبة:٣٨)

''کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔''

﴿ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (٢٨/ القصص:٦٠)

''اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو اللہ کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے، کیا تم نہیں سمجھتے۔''

﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ ﴾ (٨٧/ الاعلیٰ:١٦۔١٧)

''مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو، حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔''

﴿ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (٧/ الاعراف:١٦٩)

''اور آخرت کا گھر پرہیز گاروں کے لیے بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ۔''

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں:

﴿ فَأَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(۳۹/ الزمر: ۲۶)

''پھر ان کو اللہ نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے کاش یہ سمجھ رکھتے ۔''

﴿ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۲۷)

''اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے ۔''

اگر آخرت کا خیال کیے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کر لے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود ہے:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

(۱۱/ ھود: ۱۵۔۱۶)

''جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی ، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کیے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع ۔''

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پر کاہ سے بھی کمتر ہے:

﴿ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا قَلِيْلٌ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۳۸)

''دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں ۔''

﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ۝ ﴾ (۱۳/ الرعد: ۲۶)

''اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے ۔''

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں:

﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۸۵)۔(۵۷/ الحدید: ۲۰)

''اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے ۔''

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لیے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لیے برتنا چاہیے، جمعہ کے خطبوں میں یہ

اکثر دہرایا جاتا ہے:

إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَإِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ.

''دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔''

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لیے ہیں:

﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ﴾ (۲/ البقرہ: ۲۹)

''وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں۔''

پھر دوسری جگہ بتایا کہ خود انسان کس لیے بنا:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۵٦)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔''

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لیے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بنایا جائے دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت اسی لیے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:

﴿ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ﴾

(۲۸/ القصص: ۷۷)

''اور اللہ نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔''

انہی معنوں میں (الدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ) (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔ قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوش خبری دی گئی ہے۔ ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں، فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ ﴾

(۲٤/ النور: ۵۵-۵٦)

''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو

ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے، مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد امن بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کے پیغمبر کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔''

اللہ نے ایمان اور عملِ صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے، تاکہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پروا ہو کر میری اطاعت، عبادت اور میری احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجرا میں لگے رہیں اور اگر اس امن واطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکامِ الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا، نماز کا قیام، زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ (٢٢/ الحج: ٤١)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوقِ الٰہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے، قائم کریں اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں اور دنیا میں امورِ خیر کی تعمیل اور امورِ شر کے انسداد کا اہتمام کرسکیں، اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ ومنصب کا فریب، نہ عیش وعشرت کا ڈھوکا اور نہ شان وشوکت کا تماشا ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی ومحنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

عہدِ نبوی ﷺ میں نظامِ حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں، وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیر پا تھی، چنانچہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں، لیکن وقت کے تمدن کا سر پرغرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامہ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو ۹ ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافتِ راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی و تمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت ﷺ کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیرِ سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی و شامی حدود پر آ کر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب و تمدن کا نام نہ تھا، وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسطِ عرب اور حدودِ شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی، جس کے فرمانروا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا، یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں، لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آ گیا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظامِ سلطنت یا نظامِ تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظامِ سلطنت اور نظامِ تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظام زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا، اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی جائے۔ بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانونِ الٰہی کی اطاعت و فرمانبرداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک

کا دوسرا راستہ ہے، لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض واعمال میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے، اس طرح اسلام کے نظامِ حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی، چنانچہ اگرچہ آپ ﷺ ساری دنیا کی اصلاح کے لیے آئے تھے، مگر آپ ﷺ نے اپنا کام عرب سے شرع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور ﷺ کے سامنے بھی اور آپ ﷺ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾

(۲/ البقرة:۱٤۳)

''اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کو بتانے والے بنو اور رسول تمہارا بتانے والا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امتِ مسلمہ کے لیے اور یہ امتِ مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و راہنمائی اور ان کی تعلیم وتربیت کے لیے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہلِ عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی، چنانچہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح وہدایت کے نذر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیے آمادہ تھے اور قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپ ﷺ کو قبیلہ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا، لیکن آپ ﷺ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دارالہجرۃ بنایا، وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پر خطر تھا اور ابتدا میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لیے اس کی آب وہوا بھی سازگار نہ تھی، تاہم آپ ﷺ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی۔ لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظامِ اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آ گیا۔ اس بنا پر اسلام کے دائرۂ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ نے ان حصوں میں بھی یہی طریقہ دعوت اختیار فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے قرب وجوار کے سلاطین ورؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبول اسلام پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامہ مبارک

آپ ﷺ نے لکھا تھا، اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدمِ قبول اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا، اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نورِ اسلام سے منور ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاجِ مرصع اور تختِ زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہ حبش نے آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن کے تمام رؤسا نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آنحضرت ﷺ کے عہدِ مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا، تاہم غزوہ تبوک نے آپ ﷺ کے جانشینوں کے لیے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظامِ حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت ﷺ کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا، چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

((إِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ)) [1]

''زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔''

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظامہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف قصرِ کسریٰ و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا، یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

((اِذَا هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى بَعْدَهٗ وَاِذَا هَلَكَ قَيْصَرُ فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهٗ)) [2]

''جب کسریٰ ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں اور جب قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔''

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی، جس کا قانون اللہ کا قانون، جس کی حکومت اللہ کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک اللہ کی تھی، لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھا یا اس کو یوں کہیے کہ نظامِ اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگران حاکم ہے، شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کا کہ ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ)) [3] یعنی ''تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیرِ نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا۔'' یہی مطلب ہے۔ اس سے اسلام کے اصولِ سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آ جاتا ہے۔

[1] أبوداود، کتاب المناسك، باب الأشهر الحرم: ١٩٤٧۔ [2] صحیح بخاري، کتاب المناقب، باب علامات النبوة: ٣٦١٨، ٣٦١٩۔ [3] صحیح بخاري، کتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن: ٨٩٣۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں، ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کر کے اپنی طاقت وقوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر ہزاروں گھروں کو ویران کر کے سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ وجہاد اور اسلامی نظام حکومت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمحِ نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ ﷺ کی شخصی سرداری، نہ خاندانِ قریش کی بادشاہی نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص وہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہِ ارض وسما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الٰہی کے آگے سارے بندگانِ الٰہی کی سرافگندگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیام سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا، وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظامہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں اللہ کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ اللہ کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں اللہ کے سوا نہ کسی دوسری ارضی وسماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرمانروا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرزِ سلطنت، طریقِ حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق وباطل سے نہ ہو۔

اس مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب، ان کی ظاہری ومعنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا، ظاہری تو اس لیے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے، جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے ایسی ہی درمیانی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظام سلطنت کو مٹانے کے لیے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی، عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم واستقلال، زلزلہ انگیز قوتِ ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومت اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں اور ان اوصاف کی جلا اخلاص، للّٰہیت، صبر وتوکل واعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاقِ روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لیے اولاً ان کو اس طرزِ حکومت سے پاک رکھا گیا، جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ وجلال، رعب واقتدار اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لیے اختیار کر رکھا تھا، مذکورہ بالا اخلاق محاسن کے وجود بقا بلکہ ان کی ترقی ونشوونما کی ایک ہی صورت تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ، مامور من اللہ، ایک پاکباز راہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرتو صحبت اور تعلیم وتربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نور ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر واکراہ کے ہر فرد کو

احکامِ الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اوراحترام پرخود مجبور کردے۔

اس اصول پر جونظامِ سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں:

① یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پرمبنی ہو۔

② یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پرمبنی نہ ہوں، بلکہ اس کا اساسِ اولین محض اخلاصِ قلب اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظامِ سلطنت انہی اصولوں پرقائم کیا گیا اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا اس نظامِ سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کی رو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی، سب ایک ہی سطح پر آ کھڑے ہو گئے اور بادشاہی وشہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے، الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہلکار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کردیے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ اہلِ عرب فطرۃً خوددار تھے اوران کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرداز کی تھی، مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں، جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیراثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی، قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً: شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پرانتخاب کیے جاتے تھے، لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا، اس میں سرداران قبائل کے لیے خاص حقوق مقرر تھے، جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ، مرباع، نشیطہ اور فقول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے، عام مجالس میں لوگوں کو سردارن قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا، کہتا ہے:

وننكران شئنا على الناس قولهم و لا ينكرون القول حين نقول

''اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کردیں اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کرسکتے۔''

سرداران قبائل اپنے لیے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے: **((لاحمى الاحمى الله و رسوله))** [1] ''اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔'' اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا۔

[1] صحيح بخاري، كتاب الجهاد، باب اهل الدار يبيتون......: ۳۰۱۲۔

سلاطین شاہانہ شان وتجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر وجواہر کے زیوروں سے آراستہ ہوکر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے، ان کے امرا علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لیے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس وفرش حرام کیے گئے، سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لیے حرام ٹھہرے، امام وقت اور اس کے حکام کے لیے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا، حاجب ودربان کے پہرے اٹھ گئے، چاؤش ونقیب رخصت کر دیے گئے، طلائی ونقرئی وزمردیں تخت اٹھوا دیے گئے، امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے پستی وبلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضعِ لباس کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا، ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایک شاہی عبا لے کر آئے، چونکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ ﷺ اس کو زیب تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے، آپ اس کو پہنیں، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر اسلام کے لیے اس ظاہری جاہ وجلال اور تزک واحتشام پر گئی، جس کے شاہان وقت عادی تھے، لیکن حضور ﷺ نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ وجلال کے اظہار کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔'' [1]

اسی طرح نشست میں بھی آپ ﷺ نے تفوق وبرتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ ﷺ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد ﷺ کون ہیں؟ لوگ اشارہ سے بتاتے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے، جس پر آپ جلوہ افروز ہوں، مگر اس کو بھی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔ [2] اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانونِ الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو، تو ان کے لیے دوہری سزا ہے، ایک بار ایک مخزومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ گراں گزرا اور انہوں نے آپ کی خدمت میں

---

[1] بخاري، كتاب الجهاد، باب التجمل للوفد: ٣٠٥٤۔ [2] ابوداود، كتاب السنة، باب القدر: ٤٦٩٨۔ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے لیے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا دیا)۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی تھی، مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے، پھر فرمایا کہ اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا۔“ ❶

ایک بار آپ ﷺ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت ﷺ کے اوپر ٹوٹ پڑا، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپ نے اس سے کونچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آ گیا، آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ ”آؤ اور مجھ سے قصاص لو۔“ لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے معاف کر دیا۔ ❷

ایک بار آنحضرت ﷺ کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لیے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمایئے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔“ ❸ ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا، جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا، معاف فرمایا۔ ❹ اسلامی محاصل زکوٰۃ وصدقات وعشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندان نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں، بخلاف اس کے حضور ﷺ نے اپنے لیے جو خاص خطاب اللہ سے پایا، وہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیت کا ملہ ہی آپ کا کمال تھا، اعزاز کے وہ وہمی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ ﷺ نے ان سب کو مٹا دیا، فرمایا: ”اللہ کے نزدیک سب سے برا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے کو شاہ شاہان کہے۔“ ❺ ایک دفعہ آپ ﷺ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: ”یہ تو اللہ کے لیے ہے۔“ ❻ آپ ﷺ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ کو دوسرے انبیا علیہم السلام پر فضیلت دیں۔ ❼

ایک بار سورج میں گہن لگا، چونکہ اسی دن آپ ﷺ کے صاحبزادہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو چکا تھا

❶ یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے مثلاً کراهية الشفاعة فی الحدود اذار فع الی السلطان: ٦٧٨٨۔
❷ ابوداود، كتاب الديات، باب القود من الضربة وقص الأمير من نفسه: ٤٥٣٦۔
❸ ابوداود، كتاب الخراج والامارة، باب فی بيان مواضع قسم الخمس: ٢٩٨٧۔
❹ صحيح مسلم، كتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ: ٢٩٥٠۔ ❺ صحيح بخاری، كتاب الأدب، باب ابغض الأسماء: ٦٢٠٥۔ ❻ ابوداود، كتاب الادب، باب كراهية التمادح: ٤٨٠٦۔
❼ صحيح بخاری، كتاب احاديث الانبياء: ٣٤١٢، ٣٤١٦۔

اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے، اس لیے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی موت کی طرف منسوب کر دیا، لیکن جب آپ ﷺ صلوٰۃ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ "چاند اور سورج اللہ کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت و حیات سے گہن نہیں لگتا۔" ❶

ایک بار ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔" ❷

ایک بار آپ ﷺ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمد ﷺ کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا۔" ❸ حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جا سکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے، حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: اللہ! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر۔ آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ "تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الٰہی کو محدود کر دیا۔" ❹ حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطین زمانہ اکرام و انعام کی بارش کرتے تھے۔ سلطنت کے مفتوحات و محاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی و خاندانی عیش و آرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے، لیکن جو نظام سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لیے تھے، زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپ ﷺ نے اس کو اپنا نہیں، بلکہ باختلافِ شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے، زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندانِ ہاشم پر حرام فرما دی اور اس کو بحکمِ الٰہی عام غربا اور اہل حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا، ابوداؤد میں ہے:

((قال ما اوتیکم من شيء وما امنعکم ان انا الاخازن اضع حیث مامرت)) ❺

❶ بخاري، کتاب الکسوف: ١٠٤١۔ ❷ ابن ماجه، ابواب الاطعمة، باب القدید: ٣٣١٢۔
❸ مسند أحمد، ج٣، ص: ٤٣٥۔ ❹ بخاري، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٠۔
❺ ابوداود، کتاب الخراج والامارة، باب فیما یلزم الامام من أمر الرعیة: ٢٩٤٩۔

’’میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں، میں صرف خزانچی ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔‘‘

دوسرے موقع پر فرمایا:

((انما انا قاسم و خازن و اللّٰہ یعطی)) [1]

’’میں تو صرف بانٹنے والا ہوں دینے والا تو اللہ ہے۔‘‘

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور ﷺ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار رہتا تھا، اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضور ﷺ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے، جن کو جنگ کے قواعد کی رو سے مال غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا، اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا، وہ حضور ﷺ کے تصرف میں گو براہ راست دے دیا جاتا تھا، لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضور ﷺ اس کی آمدنی اپنے صوابدید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کی ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرمادیا تھا کہ یہ مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے، ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لیے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے، چنانچہ انہیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے اس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں، دیکھا تو آپ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی، ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حجرہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، اس منظر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ حضور ﷺ نے رونے کا سبب پوچھا، عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں، جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے ادھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں اور حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں، ارشاد ہوا کہ ’’اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟‘‘ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہ ﷺ! [2] دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

---

[1] بخاری، کتاب الجهاد، باب قول الله تعالی: ﴿فان لله خمسه﴾: ۳۱۱۷۔ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔

[2] بخاری، کتاب النکاح: ۵۱۱۹۱ ومسلم، کتاب النکاح، باب الایلاء: ۳۶۹۱، ۳۶۹۲۔

یارسول اللہ ﷺ! دعا فرمایے کہ اللہ آپ ﷺ کی امت کو فارغ البال کرے، کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ اللہ کی پرستش نہیں کرتے لیکن اللہ نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دیے ہیں، آپ ﷺ دفعتاً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: ''کیوں ابن خطاب! تم اس خیال میں ہو کہ رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیے گئے ہیں''۔ [1] اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھیے کہ وہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو حضور انور ﷺ کے لیے تزک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے، جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع [2] ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس رضی اللہ عنہ بن سعد ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت ﷺ سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں''۔ اسی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ ''کیا اگر تم میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟'' عرض کی نہیں، تو فرمایا کہ ''تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہیے۔'' [3]

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضور ﷺ کو سجدہ کیا۔ آپ ﷺ نے حیرت سے فرمایا: ''معاذ یہ کیا؟'' عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضور ﷺ کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ ''اللہ کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔'' [4]

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہلِ عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب و جوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزک و احتشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ استکبار و ترفع اور اسراف و تبذیر کی زندگی اللہ کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور حباب کی سربلندی سے زائد نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا اور آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفائے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ التحریم: ٤٩١٣؛ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب الایلاء: ٣٦٩٥۔ [2] یعنی پیونددار کپڑا (معارف جلد ١٢٢، عدد ٣، ص: ١٨١)۔

[3] ابوداود، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأۃ: ٢١٤٠۔

[4] ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأۃ: ١٨٥٣۔

راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اس کی پیروی کی اور یہی سادگی وتواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔ عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا وبخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امرا کے موروثی استحقاق اور سعی وسفارش کی بنا پر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولت مندوں کی دولت مندی اور فقرا کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے احکام الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولت مندی اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفا کا حق اقویا کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ یمنی مہرے تھے، آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا۔ [1]

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات وتصنعات اور غلامی وعبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرفِ مدعا زبان پر آتا تھا۔ اسلام کے نظامِ حکومت کا یہ حال تھا کہ حضورِ انور ﷺ کی عظمت وجلالت اگرچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بارگاہِ نبوت میں ایک طائرِ بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، ناآشنا بدو آتا تو یا محمد ﷺ کہہ کر خطاب کرتا اور حضور ﷺ خوشدلی کے ساتھ جواب دیتے اور مسلمان یارسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا، آپ ﷺ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضور ﷺ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا اور حضور ﷺ اس کو شفقت سے سنتے تھے اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے، حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی، ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے، آخر آنحضرت ﷺ نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ''تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا۔'' انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ ''نہیں! سفارش ہے۔'' عرض کی: تو قبول سے معذور ہوں، آنحضرت ﷺ نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔ [2]

غزوۂ بدر میں آنحضرت ﷺ نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فنِ جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی:

---

[1] یہ دونوں واقعے ابوداود، كتاب الخراج، باب في قسم الفيء: ۲۹۵۱، ۲۹۵۲ میں ہیں۔

[2] صحيح بخاري، كتاب الطلاق، وباب شفاعة النبي ﷺ في زوج بريرة: ۵۲۸۳ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے، اگر آزاد ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔

یارسول اللہ! آپ ﷺ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے، یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: ''رائے سے۔'' انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے، بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہیے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا۔ [1] اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

((انتم اعلم بامور دنیاکم)) [2]

''تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو، تم زیادہ واقف ہو۔''

آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لیے کرتے ہوں گے، اس لیے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں، آنحضرت ﷺ کا ادھر گزر ہوا تو دریافت فرمایا، انہوں نے صورت حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ ''میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے، میری اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہی ہوں تم آزاد ہو۔'' [3]

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے، یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے، لیکن جن امور میں آنحضرت ﷺ کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحتِ الٰہی پر مبنی ہوتا، جس کی اطلاع حضور ﷺ کو بذریعہ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ ان کا منشا حکم الٰہی ہوتا تھا، جس کا ماننا ہی ضروری ہے، اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت ﷺ نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے، اس لیے وہ جوشِ اسلام سے بے تاب ہو گئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ یارسول اللہ! آپ کیا پیغمبرِ برحق نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شبہ ہوں۔'' انہوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ ''بے شبہ ہیں۔'' انہوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا۔'' انہوں نے کہا کہ کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال

---

[1] سیرت ابن هشام، ج ۱، ص: ۳۷۸۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا: ۶۱۲۸۔

[3] صحیح مسلم، باب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا: ۶۱۲۷۔

کریں گے؟'' انہوں نے کہا: نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو تم پھر آؤ گے اور طواف کرو گے'' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی، انہوں نے بھی وہی جواب دیے جو رسول اللہ ﷺ نے دیے تھے، آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی تو انہوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا۔ [1] اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گو بہت کچھ عرض و معروض کی، مگر حضور ﷺ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا، کیونکہ یہ فیصلہ ارادتِ ربانی سے کیا گیا تھا۔

اس طرح اسی واقعہ حدیبیہ میں جب شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا، تو چونکہ ان کے شدتِ شوقِ زیارتِ کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی، اس لیے ان کو حزن و ملال ہوا اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل برتا، جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضور ﷺ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحتِ ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت ﷺ پر شاق گزرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، ام المومنین نے چہرہ مبارک پر آزردگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا، آپ ﷺ نے واقعہ بیان فرمایا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، آپ خود اپنا احرام کھول دیں، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا، شمعِ نبوت کے پروانوں (صحابہ رضی اللہ عنہم) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضور ﷺ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ [2] اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں، حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امرِ الٰہی سے تھا، اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پروا نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی، جس کا تعلق علم النفس اور امور تجربیہ سے تھا، اس لیے اس پر بلا تامل عمل فرمایا۔ [3]

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضور ﷺ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضور ﷺ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی

---

[1] بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد ..... ۲۷۳۱، ۲۷۳۲۔ نیز دیکھیں فتح الباری شرح حدیث مذکور۔

[2] صحیح بخاری، ایضاً۔ [3] اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خدانخواستہ علم النفس کا یہ نقطہ آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو معلوم تھا، بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں، جن سے کبھی ان استادوں کو اس لیے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کے فیض ہی سے حاصل ہوئی تھی۔

کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی میں آبپاشی کے متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا، انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں، آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا، قانون اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنوئیں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے، دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے، لیکن آپ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم پہلے آبپاشی کرلو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو، یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا۔ لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یارسول اللہ! آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، تب آپ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ”زبیر! آبپاشی کر کے پانی روک لیں، یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہنچ جائے۔“ [1] یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسرے کے کھیتوں میں از خود چلا جائے، یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مالِ غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنوتمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا، آیا اور کہا کہ یارسول اللہ! انصاف فرمائیے! آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟“ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور آنحضرت ﷺ سے کہا: اگر آپ اجازت دیجیے تو اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ ﷺ نے ان کو روک دیا [2] اور فرمایا کہ ”اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے، لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے۔“ (یہ پیشین گوئی امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی) یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گزر کر گستاخی کی حد تک پہنچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چین منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے برے اسلوب سے بھی آپ ﷺ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت ﷺ اپنے کرم وشفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے، آنحضرت ﷺ کے اس طرزِ عمل میں آپ کے بعد آنے والے خلفا اور امرائے اسلام کے لیے حق شناسی، حق کوشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ واعزاز اور فخر وغرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمال وحکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں اس لیے ان پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ

[1] ابوداود، کتاب القضاء، باب فی القضاء: ٣٦٣٧۔

[2] بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام: ٣٦١٠۔

پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہد نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمالِ نبوی کی شکایت کی اور آنحضرت ﷺ نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو، یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور پر سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام وعمال سے فرمایا: ''ہاں! مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کہ ان کی دعا اور قبول میں کوئی چیز خارج نہیں ہوتی۔'' 1 اور معترضین سے فرمایا کہ ''تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو۔'' 2 لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضورِ انور ﷺ سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف وکرم فرمایا اور عدل وانصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آ کر آپ ﷺ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہوگئی، آپ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا: میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو، کیونکہ جو لاد دو گے وہ نہ تمہارا مال ہوگا اور نہ تمہارے باپ کا، حضور ﷺ نے تین بار فرمایا: ''نہیں، استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ۔'' اس کے بعد فرمایا: ''میں اس وقت تک نہیں لا دوں گا، جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے، اس کا بدلہ نہ دو۔'' مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپ ﷺ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔ 3

ایک دن ایک بدو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت ﷺ پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہمکلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ ''تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس کا حق ہے۔'' اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا۔ 4

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت ﷺ کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپ ﷺ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا، لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی، لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ ﷺ بدمعاملگی کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، اس کو چھوڑ دو اس کو کہنے کا حق ہے۔'' پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ''اس کو کہنے دو، اس کو کہنے

---

1 بخاری، کتاب الزکاۃ: ١٤٩٦۔ 2 صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ارضاء السعاۃ: ٢٢٩٨۔

3 سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی الحلم واخلاق النبی ﷺ: ٤٧٧٥۔

4 ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان: ٢٤٢٥، ٢٤٢٦۔

کا حق ہے۔" اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک انصاری کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم وعفو اور حسنِ معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا:
"محمد (ﷺ)! تم کو اللہ جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی"۔ [1]

بہر حال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے، ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا و ناروا بے ہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے، جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا، میعاد ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور آنحضرت ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت وسست کہہ کر کہا کہ "اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ سے بے تاب ہو گئے، اس کی طرف منہ کر کے کہا: او اللہ کے دشمن! تو رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر کہا: "عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں۔" یہ فرما کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کو ارشاد ہوا کہ جاؤ اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو، یہودی حلم وعفو کے اس پُر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ [2]

ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجیے، آنحضرت ﷺ نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں، آنحضرت ﷺ نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ "وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔" [3]

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور ﷺ، جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، لوگوں نے اس حیثیت سے آپ ﷺ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا، آپ ﷺ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا اور معاملہ کا فیصلہ کیا یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی۔ ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امرا کے غرور وتبختر سے ملایئے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرت ناک سزائیں دیتے ہیں اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ج٦، ص: ٢٦٨۔ [2] یہ روایت دلائل النبوۃ بیہقی، جماع ابواب اسئلۃ الیہود، ج٧، ص: ١:٣٠ ابن حبان: ٢٨٨؛ طبرانی فی الکبیر، ج٥، ص: ١٦٥ اور ابونعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفاء از شہاب خفاجی، ج٢، ص: ١٣١ فصل حلم)۔

[3] جامع ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی الرخصۃ فی الشراء الی اجل: ١٢١٣۔

کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دارو گیر سے برتر ہے، اس سے بھلا برا جو کچھ ہو، وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے، لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم و محکوم اور راعی و رعیت قانون کی دارو گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ معصوم تھے، جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہوسکتا تھا، بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا اور آپ کی خدمت اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصل جہنم کرسکتی تھی، باایں ہمہ آپ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لیے تھا کہ آپ ﷺ کا یہ اسوہ آیندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لیے عملی سبق ہو اور اس کے لیے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے، تاکہ آیندہ آنے والے امرا اور حکام استفسار و اظہارِ رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھی، ان میں ایران نے کبھی ذاتِ شاہانہ پر اس رو در رو سوال و جواب استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، یونان اور روم میں کسی زمانے میں سنتے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قائم تھیں لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امرا کی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا اور نہ ان کو امرا کے مقابلے میں یہ حقِ سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امراو حکام میں اس تواضع، اس خاک ساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا اور نہ آسکتا تھا، وہ اخلاصِ قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا اور وہ اس کے پجاری تھے اور وہ اس دیوتا کے لیے سب کچھ کرسکتے تھے اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا، جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز ناآشنا تھی، اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے، بلکہ اس ذات اقدس ﷺ سے ہے، جس کی خاکِ عقیدت مسلمانوں کی چشمِ ادب کا سرمہ تھی اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی، بلکہ اس سے بدر جہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی، صلوات اللہ تعالیٰ علیہ۔ اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے، ظاہر ہے کہ حضور انور ﷺ کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ ﷺ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی، لیکن آپ مشورہ کرتے تھے، ایک تو اس لیے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے اور دوسرے اس لیے کہ چونکہ آپ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا ہے، اس لیے آپ ﷺ کا یہ فعل

یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفا وامرا کے لیے مثال ونظیر کا کام دے، آپ ﷺ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ

﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾ (۳/ آل عمران :۱۵۹)

''اے رسول (ﷺ)! امور سلطنت و جنگ وصلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجیے۔''

چنانچہ حضور ﷺ نے اس پر بہ نفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، انہوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ

﴿ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۳۸)

''ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔''

اگر چہ عہد نبوت میں حکومت کے سارے اجزا وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی، تاہم احادیث کے تتبع واستقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حکومت سے متعلق، متعدد اہم امور کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا اور ان کی رایوں پر عمل کیا اور اس کا منشا صرف یہی ہوسکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضورِ انور ﷺ کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، یہود ونصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق وناقوس بجایا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، [1] بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپ ﷺ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپ ﷺ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، انہوں نے اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَةٌ کہہ کر پکارا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت ﷺ کو رؤیا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی [2] اور فیضِ تاثیر سے بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور آکر آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ [3]

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدان جنگ کے قریب پہنچ کر آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا

---

[1] بخاری، کتاب الاذان، باب بدء الاذان: ٦٠٤ نیز دیکھیں مشکوٰۃ، باب الاذان۔

[2] مصنف عبدالرزاق وطبقات ابن سعد وکتاب المراسیل لابی داود وفتح الباری ابن حجر وروض الانف سهیلی وزرقانی علی المواهب ونووی شرح مسلم باب بدء الاذان۔ نووی میں ہے: فشرعه النبی ﷺ، بعد ذلك اما بوحی واما باجتهادہ ﷺ علی مذهب الجمهور فی جواز الاجتهاد له ﷺ ولیس هو عملاً بمجرد المنام هذا مالا یشك فیه بلاخلاف۔

[3] ابوداود، کتاب الصلوة، باب کیف الاذان:٤٩٩؛ ترمذی باب بدء الاذان:١٨٩۔

کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہاں تک کہ ایک رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یارسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑے ہم تو یہیں رہیں گے، اللہ کی قسم! اگر آپ ﷺ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے [1] اس کے بعد جب آپ ﷺ میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک تجربہ کار صحابی نے آ کر عرض کی: یارسول اللہ! آپ حسب فرمان الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضور کی یہ اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ ''یہ میری رائے ہے۔'' اس پر انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہیے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے، آنحضرت ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا وہیں جا کر قیام فرمایا۔ [2] آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپ نے پھر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔ [3]

احد کے موقع پر آنحضرت ﷺ کا صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں، اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافق مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، پھر پرجوش جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کا عرض کرنا کہ حضور شہر سے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہیے اور حضور ﷺ کا صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا امورِ حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوۂ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مال غنیمت میں آپ کے پاس آیا ہے، واپس کر دیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا۔'' ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا اور آپ نے ان کی درخواست قبول کر لی، اگرچہ آنحضرت ﷺ کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی آپ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ ''تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں، اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے، جس کو مجھ سے اتفاق ہو، وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو، وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں، جس وقت پہلا مال غنیمت آئے گا، ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا۔'' تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھے کہ یارسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کے اس عاجلانہ اظہار

[1] سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۷۵۔ [2] سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۷۸۔
[3] ترمذی، ابواب التفسیر باب ومن سورۃ الانفال: ۳۰۸۴۔

رائے کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا کہ ہر ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے کون راضی نہیں ہے؟ اس لیے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام وعریف ہمارے پاس بھیجنا چاہیے، چنانچہ ان قائمقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ ﷺ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی۔ [1]

احادیث کی کتابوں کا استقصا کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیام سلطنت اور آئینِ سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا، اس شعبہ حیات کو جس میں تمام تر درندگی، بہیمیت، مکر وفریب، غل وسازش، ظلم وستم اور جور وتعدی شامل تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک وبلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا، احادیث میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ ((السلطان ظل اللّٰه في الارض يأوى اليه كل مظلوم من عباداللّٰه)) [2] یعنی ''صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے، جس کے دامن میں بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے''۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ

السلطان العادل المتواضع ظل اللّٰه ورمحه فى الارض. [3]

''عادل اور متواضع حاکم زمین میں اللہ کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔ خود حضور ﷺ نے فرمایا:

''عادل امام کو قیامت کے دن اللہ کا سایہ نصیب ہوگا۔'' [4]

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسنِ عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا، جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہوگئی اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، فریب، سازش،

---

[1] ابوداود، كتاب الجهاد، باب في فداء الاسير بالمال:٢٦٩٣ وصحيح بخاري، كتاب المغازي:٤٣١٨، ٤٣١٩۔

[2] و [3] یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ابن ابی شیبہ میں ہے، یہ حضور ﷺ تک مرفوع نہیں بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں، تفصیل کے لیے دیکھئے المقاصد الحسنۃ سخاوی اور كشف الخفاء ومزيل الالباس اسماعيل عجلوني، ج١، ص: ٤٥٦ مكتبه قدسى: ١٣٥١ھ لفظ سلطان۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عربی میں السلطان کے معنی بادشاہ کے نہیں، بلکہ طاقت وقوت کے ہیں، جو انگریزی لفظ پاور (Power) کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مترادف ہیں، اس لیے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ عادلانہ نظام حکومت مخلوقات الٰہی کے آرام وآسائش کے لیے گویا زمین میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ عمال حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمائندے ہیں سلطان کا اطلاق ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے ((اَلسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَّاوَلِيَّ لَهُ)) یعنی ''جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے۔'' یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے، اس لیے اس کا ہر جائز نمائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا، بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

[4] صحيح بخاري، كتاب الحدود، باب فضل من ترك الفواحش:٦٨٠٦۔

تعدی وظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہوگیا، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدتِ معینہ کے لیے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لیے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے، جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہیے، یہ سن کر انہوں نے اپنی فوج ہٹالی۔ [1]

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گزاری اور خراج کے وصول کرنے کے لیے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا تھا اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعتۃً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے خدع وفریب، مکر وحیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا، اس میں شخصی وجمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے، یورپ آج ظاہری ونمائشی تمدن وتہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ تمام ملک میں تعلیم عام ہوگئی ہے، ہر فرد رموز سیاست سے واقف ہوگیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلّم ہوگیا ہے، لیکن بایں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لیے ہزاروں، لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں، باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لیے دی جاتی ہے، لیکن بایں ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت ودلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے، لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب وثواب سمجھتا ہے، اس لیے ان پر بلا جبر واکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہوسکتا ہے، اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ وزکوۃ عرب کے لیے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس وغربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لیے مشکل تھا، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی، ان میں ایک صدقہ وزکوۃ کی گراں باری بھی تھی، صدقہ اور زکوۃ کے وصول کرنے کے لیے اگرچہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک ہی میں عمال

[1] سنن ابی داود، کتاب الجهاد، باب فی الامام یکون بینه وبین العدو عهد: ۲۷۵۹۔

مقرر کر دیے گئے تھے، تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر و سر رشتہ اور نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظام سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے:

كان رسول الله ﷺ اذا اتاه قوم بصدقتهم قال: ((اللّٰهم صلّ على ال فلان)) فاتاه ابى بصدقته فقال: ((اللّٰهم صلّ على ال ابى اوفىٰ)) [1]

''آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ ﷺ فرماتے تھے کہ خداوندا! فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ خداوندا! ابواوفیٰ کی آل پر رحمت بھیج۔''

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ قبیلہ طے کے سردار تھے اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھا حصہ ملتا تھا، جو عرب میں اسلام سے پہلے سردارانِ قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا، لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

ان اول صدقة بيّضت وجه رسول الله ﷺ و وجوه اصحابه صدقة طى جئت بها الى رسول الله ﷺ . [2]

''پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا چہرہ چمک اٹھا، قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔''

قبیلہ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((صدقات قومنا)) [3]

''یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔''

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جا کر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو

[1] صحيح بخارى، كتاب الزكوة، باب صلوة الامام ودعاء ه لصاحب الصدقة: ١٤٩٧۔
[2] صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل غفار واسلم ..... : ٦٤٤٩۔
[3] صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب فضائل غفار و اسلم ..... : ٦٤٥١۔

مزدوری ملتی تھی اس کو لاکر صدقہ میں دیتے تھے۔ ❶

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے تھے، لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نورِ ایمان سے چمک اٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لیے بیتاب ہو جاتے تھے، چنانچہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے بارگاہِ نبوت میں آ کر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے۔ اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں، مثلاً: چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں یا سنگسار کیا جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور یہی حکمت لوگوں میں اعترافِ جرم کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے اپنے جرموں کا ازخود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ ایک صاحب تھے، انہوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا، جب انہیں ہوش آیا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر ازخود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی: یارسول اللہ! مجھے پاک کیجیے ❷ یارسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جائے، آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، انہوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمایئے، اسی طرح وہ بار بار اعترافِ جرم کرتے تھے اور آپ اعراض فرماتے رہے، چوتھی بار آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کیا تم اس کے ساتھ ہم بستر ہوئے؟'' انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟'' انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟'' انہوں نے کہا: ہاں۔ ان تمام مراتب کے بعد آپ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا، جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انھوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر ماری اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا۔ شاید وہ توبہ کرتے اور اللہ ان کی توبہ کو قبول کر لیتا۔'' ❸

اس واقعہ سے قانونِ سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو جائے گا۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ: ۱۴۱۵، ۱۴۱۶ وکتاب الاجارۃ، باب من اجر نفسہ ...: ۲۲۷۳۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسہ بالزنی: ۴۴۳۱۔

❸ ابوداود، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک: ۴۴۱۹ وصحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الرجم بالمصلی: ۶۸۲۰۔

ایک اور نو جوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن انہوں نے از خود اپنے تیمارداروں سے اس کا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو، چنانچہ حضور ﷺ سے عرض کیا گیا، حضور ﷺ نے ان کی شدتِ علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی۔ [1]

کعب بن عمرو ایک اور صاحب کا واقعہ ہے جنھوں نے آ کر یہ اقرار کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے، گو ہم بستر نہیں ہوا، تو یہ گناہگار موجود ہے، اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے۔ [2]

غزوۂ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا، قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرف دار رئیس خدمت اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا، آنحضرت ﷺ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، ایک نے اٹھ کر کہا: یارسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضور ﷺ نے دیت ہی پر زور دیا یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے میری مغفرت کے لیے دعا فرمائیے۔ [3]

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حدِ فاصل قائم کر دیتے ہیں، دنیوی سلطنت میں مجرم اس لیے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی، لیکن ماعز رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجرا سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے اور آنحضرت ﷺ کی دعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے، دنیوی سلطنت میں جلاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے ماعز پر اس لیے پتھر برسائے کہ انہوں نے حکم الٰہی کی بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی، دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظامِ سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرزِ عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے، جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لیے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رحم دل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے، بڑے بڑے جرائم درگزر کر سکتی ہے، رعایا کے ساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برتاؤ کر سکتی ہے، لیکن وہ کسی بدخواہِ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی، عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض

---

[1] ابوداود، كتاب الحدود، باب في اقامة الحد على المريض: ٤٤٧٢۔

[2] ايضًا، باب في يصيب الرجل ما دون الجماع: ٤٤٦٨ وصحيح بخاري، كتاب الحدود: ٦٨٢٣۔

[3] ابوداود، كتاب الديات، باب الامام يأمر بالعفو في الدم: ٤٥٠٣۔

ایسے کام کیے جن سے بظاہر جنگی وسیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انہوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی، حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، انہوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے اللہ، اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آنحضرت ﷺ نے حاطب سے پوچھا کہ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟'' حاطب نے کہا اللہ کی قسم! میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل واولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں، ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہ تھا، اس لیے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''سچ کہتے ہیں، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، بدگمانی کو راہ نہ دو۔'' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ اس نے اللہ اور اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر اللہ نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:

((اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَكُمُ الْجَنَّةُ))

''جو چاہو کرو، کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔''

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ اللہ کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے۔ [1]

آنحضرت ﷺ نے حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ شرکتِ بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی، اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سیاست کا ایک لازمی جزو بدگمانی ہے اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دور اندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز واقارب تک سے چھپائے، لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم ومحکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دارومدار اخلاص باللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوصِ اعتماد کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے حاطب بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی، آنحضرت ﷺ نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

[1] بخاري، كتاب المغازي، باب فضل من شهد بدرًا، ٣٩٨٣۔

((حسن الظن من حسن العبادة)) ❶

''حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔''

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

﴿ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۲)

''بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے:

((انّ الامیر اذا ابتغی الریبة فی الناس افسدھم)) ❷

''جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کر دے گا۔''

اور عمالِ سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

عن معاویة قال سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول: ((انك ان اتبعت عورات الناس افسد تھم أو کدت ان تفسد ھم)) ❸

''حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا ہے یا عنقریب برباد کر دو گے۔''

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی ڈاڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، لیکن چونکہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لیے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔ ❹

دخین حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ صحابی کے منشی تھے، انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لیے پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''درگزر کرو'' دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترکِ شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے پھر فرمایا کہ ''درگزر کرو'' کیونکہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ

((من رای عورة فسترھا کان کمن احیی موء ودة)) ❺

''جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپا لیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے، جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچا لیا، جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔''

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب فی حسن الظن:۴۹۹۳۔ ❷ ابوداود، کتاب الادب، باب فی التجسس: ۴۸۸۹۔ ❸ ابوداود، کتاب الادب، باب فی التجسس:۴۸۸۸۔ ❹ یہ تمام حدیثیں ابوداود، کتاب الادب، باب فی التجسس: ۴۸۹۰۔ ❺ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الستر علی المسلم: ۴۸۹۱۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہوسکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے، اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوی میں ملتا ہے، اس لیے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ڈیل ڈول، وسعتِ علم، حسنِ خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے، سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگران ہے، اس لیے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہے اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے، اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لیے مضر ہے اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے، سلطان کی خوبیوں کا تمام تر دارو مدار نرمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے اور لوگ ان سے بچنے کے لیے جھوٹ اور مکر و فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہو جاتا ہے، وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلو تہی کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبہ محبت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، ان کے گناہوں سے درگزر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں، پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے، سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم و توابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں، مثلاً: ان پر احسان کرنا اور ان کی معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جاننا چاہیے کہ یہ لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں، ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے، بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رس ہوتی ہے اور وہ ابتدا ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس لیے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں

جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں، اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو اور حاکم کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا: کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اسی بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہاری عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔'' [1]

ابن خلدون نے ان خطروں میں جو آئین جہاں بانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس طرز عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت اللہ کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو قانونِ شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے، جس سے لوگوں میں امن واطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو۔ عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر وغریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثبات جرم میں شکوک وشبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں، ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا:

((ان اللّٰه يعذب الذين يعذبون في الدنيا)) [2]

''بے شبہ اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔''

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم وستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت ﷺ کا فیضِ صحبت اٹھایا تھا، انہوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گزر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کیے گئے تھے، انہوں نے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے، انہوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ ''اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔'' دنیوی حکمران لطف ومحبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں، غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ

[1] مقدمہ ابن خلدون فصل فی ان ارھاف الحد مضر بالملك، ص: ۱۵۷، ۱۵۸۔

[2] مسلم، كتاب البر والصلة، باب الوعيد الشديد لمن عذب الناس بغير حق: ٦٦٥٧ تا ٦٦٦٠۔

ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوموں کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کا خمیر تھا اور اس لیے یہ ابرِ کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا، معاملاتِ حکومت میں خود آپ ﷺ کا طرزِ عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کر دیں گے، مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت ﷺ کے اس فیاضانہ طرزِ عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مرد دو عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہیے کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں، [1] یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمایئے، آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا وضو کر کے چلے تھے؟'' اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا ''کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟'' اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ اللہ نے معاف کر دیا۔'' [2] لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپ ﷺ کو اپنے کام کے لیے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی، ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے کام کے لیے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں۔'' چنانچہ آپ ﷺ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دے دیا۔ [3] عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جو مذہبًا نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے، جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو ان کو شک تھا کہ آیا حضور ﷺ بادشاہ ہیں یا نبی ہیں، لیکن جب ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گزرا تو کہہ اٹھے کہ حضور ﷺ بادشاہ نہیں کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اوپر ایسے گزر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے حضور ﷺ ان کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے، ایک بدو نے ایک دفعہ آپ ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا، [4] بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو جاتے تھے جن کے لیے ان کو مالی کفارہ

---

[1] ابوداود، کتاب الحدود، باب فی رجم الیهودیین: ٤٤٥٠۔ [2] ابوداود، کتاب الحدود، باب فی الرجل یعترف بحد ولا یسمیه: ٤٣٨١ جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا، اس لیے بحکم ان الحسنات یذهبن السیئات اس قصور کی معافی کی خوش خبری دی گئی۔ [3] مسلم، کتاب الفضائل، باب فی قربه ﷺ من الناس: ٦٠٤٤۔

[4] بخاری، کتاب الادب، باب التبسم والضحك: ٦٠٨٨۔

ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے تو آنحضرت ﷺ بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے۔ اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا، [1] لیکن آخر ایک [2] رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی، صبح کو گھبرا کر انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کیا، آپ ﷺ نے دو بار فرمایا: ''کیا تم نے ایسا کیا؟'' انہوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی: ہاں، ہاں، یا رسول اللہ! مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب اللہ کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں، فرمایا: ''ایک غلام آزاد کر دو۔'' انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یا رسول اللہ! اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مستقل دو مہینے کے روزے رکھو۔'' عرض کی: یا رسول اللہ! جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو۔'' عرض کی: یا رسول اللہ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے، آپ ﷺ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ ''صدقہ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ، وہ تم کو اس قدر کھجوریں دے دے گا اس میں سے ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بچوں کو کھلاؤ۔'' وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمہارے یہاں تنگی و بدتدبیری اور رسول اللہ ﷺ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا۔ [3]

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم ﷺ کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلاطین دنیوی کے تاج ہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آسکتی، عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کیے گئے تو ان ہی خودسر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوش عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہدِ نبوت میں پیش آئے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سفر سے پریشان، بال الجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پوچھے، فرمایا: ''دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں۔'' عرض کی: کچھ اور

[1] ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرماتِ شرعی سے تشبیہ دے دی جائے، جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں کے برابر ہے اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے۔ [2] اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نامہ نازل نہیں ہوا تھا۔

[3] ابو داود، کتاب الطلاق، باب الظهار: ۲۲۱۳۔

نمازیں بھی؟ فرمایا: ''نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو۔'' پھر فرمایا: ''اور رمضان کے روزے'' سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا: ''نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو'' پھر زکوۃ کو ذکر فرمایا، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا: ''نہیں، مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو'' اتنا سوال و جواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ اللہ کی قسم! میں ان میں کمی و بیشی نہ کروں گا، یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ شخص کامیاب ہوگیا اگر سچا نکلا۔'' [1]

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آ کر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ ﷺ کو اللہ نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: ''اس نے سچ کہا'' اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے'' اس نے کہا: زمین اور پہاڑ کس نے بنائے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے'' اس نے پھر کہا: ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: ''اللہ عزوجل نے'' اس نے کہا: اس اللہ کی قسم! جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا پہاڑ کو کھڑا کیا ان میں فائدے رکھے، کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟ فرمایا: ''ہاں۔'' اس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں اور ہمارے مال میں زکوۃ ہے؟ فرمایا: ''اس نے سچ کہا'' کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا، کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: ''بے شک۔'' پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟ فرمایا: ''ہاں! سچ کہا'' اس نے کہا: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو رسول بنایا، کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ''ہاں۔'' پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانہ کعبہ کا حج کریں۔ فرمایا: ''ہاں، سچ کہا۔'' عرض کی: اس کی قسم جس نے آپ کو بھیجا، کیا اللہ نے اس کا حکم دیا؟ فرمایا: ''ہاں'' اس نے عرض کی: قسم ہے اس کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا، ارشاد ہوا: ''اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہوگا۔'' [2]

ایک اور مجلس میں صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضور ﷺ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے، اتنے میں ایک شترسوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا، پھر مجمع کے پاس آ کر پوچھنے لگا، تم میں محمد ﷺ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے! حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں کہو۔'' اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا، فرمایا: ''جو چاہو پوچھو۔'' اس نے کہا: میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟

[1] بخاري، كتاب الايمان، باب الزكوة من الاسلام: ٤٦۔

[2] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب السؤال عن أركان الإسلام: ١٠٢۔

فرمایا: ''خدایا ہاں۔'' پھر فرمایا: اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: ''خدایا ہاں۔'' پھر کہا: اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں؟ فرمایا: ''خدایا ہاں۔'' پھر کہا: اللہ ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟ فرمایا: ''خدایا ہاں!'' اس نے کہا: میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ ﷺ آئے ہیں، اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں، میں ضمام بن ثعلبہ ہوں۔ [1]

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے اور شیفتگی و جان نثاری کا ایک اور واقعہ سنیے۔

خیر! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور ﷺ کے ساتھ پیش آئے، صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت ﷺ کے جانثار تھے، وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گزرے تو ان کے ساتھ بھی انہوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عازب رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے، بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضور کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے۔ [2]

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدان جنگ ہے، آنحضرت ﷺ کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جہاد ہی میں بسر ہوا ہے، صحابہ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ ﷺ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم وایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفارِ قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے آنحضرت ﷺ سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے، عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپ کی ڈاڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب ان کا ہاتھ آپ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا، مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوشِ عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا لعاب دہن بھی گرتا تھا تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے تھے۔ جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیے سبقت کرتا ہے، جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپ ﷺ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظرِ جاہ وجلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب القراءۃ والعرض علی المحدث:٦٣۔

[2] ابوداود، کتاب الحدود، باب فی الرجل یزنی بحریمہ:٤٤٥٦۔

اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہوں، جس قدر محمد کے اصحاب محمد ﷺ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپ ﷺ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیے پیش دستی کرتا ہے۔ جب آپ ﷺ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لیے لڑتا ہے۔ جب آپ ﷺ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ تعظیماً آپ ﷺ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے۔ [1]

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپ ﷺ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انہوں نے کہا:

ایانا تریدیارسول اللّٰہ! والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضھا البحر لاخضناھا ولو امرتنا ان نضرب اکبادھا الی برك الغماد لفعلنا۔ [2]

"یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد [3] پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔"

غزوۂ احد میں جب آپ ﷺ نے کفار کی جمعیت کو ذرا گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپ کو روکا، اس سے زیادہ جوش محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے، انہوں نے کہا:

بابی انت وامی لاتشرف یصبك سھم من سھام القوم نحری دون نحرك۔ [4]

"میرے باپ ماں آپ ﷺ پر قربان، آپ گردن بڑھا کر نہ دیکھئے کہیں آپ کو کوئی تیر نہ لگ جائے، میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔"

خیر یہ تو صحابہ اور حضور انور ﷺ کے درمیان کے واقعات تھے، آنحضرت ﷺ کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کو عمالِ نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں، فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت

---

[1] بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد والمصالحة: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة بدر: ۴۶۲۱۔ [3] یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

[4] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة احد: ۴۰۶۴۔

سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی، اس پر یہودیوں نے کہا: ''یہ تو بہت ہے''۔ انہوں نے کہا: اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں، تم لوگ اس کا نصف لے لینا، اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے:

هذا الحق وبه تقوم السماء والارض قد رضينا ان نأخذه بالذی قلت۔ [1]

''انصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف سے آسمان و زمین قائم ہیں جو کچھ تم نے کہا ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔''

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی، لیکن انہوں نے کہا: اے اللہ کے دشمنو! تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو، اللہ کی قسم! میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں، جو محبوب ترین خلائق ہے اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قائم ہیں۔ [2]

[1] ابوداود، کتاب البیوع، باب فی المساقاۃ: ۳٤۱۰۔

[2] فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ، ص: ۳۱۔

سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دو۔ [1] اس تعلیم میں قیصر اور اللہ دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاصِ نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین وضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم وقوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اصل دینِ الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا اور وہ اسلام ہے، ﴿ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹) ''اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے۔'' اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے، مگر سلطنتِ الٰہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطنت الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم وآمر مانا گیا ہے، وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہِ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے، جل شانہ و تعالیٰ اسمہ بادشاہی اسی کی ہے، حکم اسی کا ہے فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے۔ دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکم الٰہی ہو، یا اس کا مبنی ہو اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو، آنحضرت ﷺ اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرمانروا تھے، آپ ﷺ کے احکام کی بجا آوری عین احکامِ الٰہی کی بجا آوری ہے:

﴿ مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ﴾ (٤/ النسآء:٨٠)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

آپ ﷺ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ ﷺ کے جو جانشین اور خلفا ہوئے، ان میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی، وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمانروا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب

[1] انجیل۔

(۳۸/ ص:۲۴۔۲۶)

''اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی اللہ نے) ان کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے، اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔''

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے اللہ کی عبادت میں مصروف رہنے لگے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسبِ احکامِ الٰہی فرائضِ خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((ما من امام یغلق بابه من ذوی الحاجة و الخلة و المسکنة الا اغلق اللّٰه ابواب السماء دون خلته و حاجته و مسکنته)) [1]

''جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا۔''

((من ولی من امر المسلمین شیئا فاحتجب دون خلتهم و حاجتهم و فقرهم و فاقتهم احتجب اللّٰه عزوجل یوم القیامة دون خلته و فاقته و فقره)) [2]

''جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔''

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انہوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لیے نہیں کھڑی کی اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لیے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں [3] کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

---

[1] جامع ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی امام الرعیة:۱۳۳۲۔

[2] مستدرك حاکم، کتاب الاحکام٤، ص ۹۳، ۹٤۔

[3] چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لیے اذن کا حکم ہے، اس لیے خود آنحضرت ﷺ نے اور خلفا نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے، مگر عام پبلک مقامات، مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لیے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگوایا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اس لیے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینے واپس چلے آئے۔ ❶

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکمِ نبوی سے باخبر کیا تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا جو اہل حاجت پہنچے تو اس کی ضرورت سن کر ان کو مطلع کر دے۔ ❷

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائض حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں:

﴿ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٥٨۔٥٩)

''امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، اللہ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بیشک اللہ سنتا (اور) دیکھتا ہے، مومنو! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحب حکومت ہیں، ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔''

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہلِ تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہہ کر ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

﴿ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝ ﴾ (٥٥/ الرحمٰن:٩)

''اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو۔''

---

❶ مسند احمد، ج ١، ص:٥٤۔ ❷ ترمذی، ابواب الاحکام:١٣٣٢۔

یہ اور اسی معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لیے تولتے ہو، اسی پیمانہ سے اپنے لیے بھی تو لو:

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝ ﴾ (۸۳/ المطففین:۱۔۳)

''پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔''

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے اور خلافِ انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲ و ۴۹/ الحجرات:۹)

''اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۵۷، ۱۴۰)

''اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۴۰)

''بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا اللہ تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے تحت ادا ہوں:

﴿ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۷)

''اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔''

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے:

((الا ایّھا الناس لا یقبل اللّٰہ صلوٰۃ امام حکم بغیر ماانزل اللّٰہ)) [1]

''ہاں اے لوگو! جو امام، اللہ نے جو قانون اتارا ہے اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے، اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔''

[1] مستدرک، کتاب الاحکام، ج ۴، ص ۸۹۔

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ منافق ہے اور اس لیے اس کی نماز یعنی اظہار اطاعت بارگاہ الٰہی میں بے معنی ہے۔ اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت وفرمانروائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضہ سے حسب احکام الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں، ان کے لیے آخرت میں رحمت الٰہی کا سایہ ہے اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کے لیے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں، فرمایا:

((الامام الذی علی الناس راع ھو مسئول عن رعیّتہٖ)) [1]

''وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے وہ نگران کار ہے، اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص کے متعلق بازپرس ہوگی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت وخلافت تاج وتخت کی بہار اور عیش وعشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گزر گیا، اس کے لیے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام وآرائش ہے اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا، وہ اس دنیا میں بھی ذلیل وبدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا وخوار ہوگا۔

((ما من عبد یسترعیہ اللّٰہ رعیۃ فلم یحطھا بنصحہٖ الالم یجد رائحۃ الجنۃ)) [2]

''جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔''

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبیداللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ ﷺ کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے:

((ما من عبد یسترعیہ اللّٰہ رعیۃ یموت یوم یموت وھو غاش لرعیتہ الاحرّم اللّٰہ علیہ الجنۃ)) [3]

''جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے، وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔''

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت وحکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے، ایک اور صحابی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ: اطیعوا اللہ...: ۷۱۳۸۔

[2] ایضا، باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح: ۷۱۵۰۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامیر العادل...: ۴۷۲۹۔

جن کا نام عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہے، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے، عبیداللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے ہیں اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

((ان شر الرعاء الحطمة)) ❶

''سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنے رعیت کو توڑ ڈالے۔''

تو تو ان میں سے نہ بن، اس نے کہا: آپ محمد ﷺ کے اصحاب میں بھوسی ہیں، فوراً بولے، کیا حضور ﷺ کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے اور ان کے بعد والے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل کی سیاست انبیا فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گزر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، نبوت مجھ پر ختم ہوگئی، البتہ خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی۔'' صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! تو ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا: ''پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، پھر عہد بہ عہد اوروں کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو۔'' (یعنی اپنے حق کی پرسش اللہ پر چھوڑ دو)

((فَاِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ)) ❷

''کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق باز پرس فرمائے گا جن کی نگرانی اس نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔''

حضور ﷺ نے اپنی امت کے امرا کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے:

((اللّٰھمّ من ولی من امر امّتی شیئا فشق علیھم فاشقق علیه و من ولی من امر امّتی شیئا فرفق بھم فارفق به)) ❸

''اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا۔''

حضور ﷺ کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرۂ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے، ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے:

((الا کلّکم راعٍ و کلّکم مسئول عن رعیته والرجل راعٍ علی اھل بیته وھو مسئول عنھم والمرأة راعیة علی بیت بعلھا وولدہ وھی مسئولة عنھم والعبد

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلة الامیر العادل: ٤٧٣٣۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل: ٣٤٥٥۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلة الامیر العادل: ٤٧٢٢۔

راع علی مال سیدہ و هو مسئول عنه الا فکلکم راعٍ و کلکم مسئول عن رعیته)) ❶

''ہاں! تم سب نگران کار ہو اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص ورعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگرانِ کار ہے اس کے زیر نگران کے متعلق پرسش ہوگی اور مرد اپنے گھر والوں کا نگرانِ کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائے گی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگران ہے، اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے، اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا، تو ہاں ہوشیار رہو، تم سب نگرانِ کار ہو اور تم سے اس کے زیر نگران کے بابت بازپرس کی جائے گی۔''

لفظ رعیت

اس موقع پر مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے اور وہ رعیت ہے اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے، حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں، یہ الفاظ لفظ ''رعی'' سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں، راعی چرواہا اور رعیۃ وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے، اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے، جس کی تربیت و پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے، جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے۔ اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضورِ انور ﷺ کی زبانِ مبارک پر لفظ ''رعیت'' کس قدر شفقت آمیز اور پرمحبت معنوں میں آیا ہے اور ظالم و سفاک امرا اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عملاً استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امامِ عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوں گے، رسول اللہ ﷺ نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے:

((ان المقسطین عند اللّٰہ علی منابر من نور عن یمین الرحمٰن و کلتا یدیه یمین الذین یعدلون فی حکمهم واهلیهم وما ولوا)) ❷

''بے شک انصاف کرنے والے (حکام و امرا) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت امور میں عادل ہوں۔''

❶ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللّٰہ تعالی: اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول.....: ۷۱۳۸؛ صحیح مسلم، ایضًا: ۴۷۲۴۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامیر العادل: ۴۷۲۱۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے، جامع ترمذی میں ہے:

((ان احب الناس الی اللّٰہ یوم القیامۃ وادناھم منہ مجلسًا امام عادل وابغض الناس الی اللّٰہ وابعدھم منہ مجلسًا امام جائر)) ❶

''بے شبہ سب لوگوں سے اللہ کو محبوب اور اللہ سے قریب امام عادل ہوگا اور اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض اور اللہ سے دور وہ امام ہوگا، جو ظالم ہو۔''

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم وامیر عدل وانصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے، فرمایا:

((ما من امیریلی امر المسلمین ثم لا یجھد لھم الالم یدخل معھم الجنۃ)) ❷

''جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو، پھر وہ ان کے لیے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔''

((ما من وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت و ھو غاش لھم الا حرم اللّٰہ علیہ الجنۃ)) ❸

''کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیرنگرانی جماعت کا والی ہو، وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہو، اس پر جنت حرام ہے۔''

((انما الامام جنۃ یقاتل من وراءہ و یتقی بہ فان امر بتقوی اللّٰہ وعدل فان لہ بذالك اجرًا وان امر بغیرہٖ فان علیہ وزرا)) ❹

''امام ڈھال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے، تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لیے بڑی سزا ہے۔''

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت وریاست اور سلطنت وولایت بھی امورِ دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب وعذاب اور جزا وسزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور واعمال اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال وعبادات کے دوسرے

---

❶ ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی الامام العادل:۱۳۲۹۔
❷ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ:۴۷۳۱۔
❸ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح:۷۱۵۱۔
❹ نسائی، کتاب البیعۃ، باب ذکر مایجب للامام:۴۲۰۱۔

شعبوں سے کم نہیں اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الٰہی ہیں یا قوانینِ الٰہی ہیں۔ یہ احکام الٰہی اور قوانینِ الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جزو ہے۔

ایک مدت سے علما کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہلِ علم اور اہلِ اتقاء کو کنارہ کش رہنا چاہیے، حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے:

گدائے [1] گوشہ نشینی تو حافظا مخروش   رموز مملکت خویش خسرواں دانند

''اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور و غل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں تم کو ان سے کیا سروکار۔''

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکامِ الٰہی کی تبلیغ اور اجرا کے لیے ہے اور یہ عین دین ہے، اسلام میں جس قتال و جہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے اور جس پر اُخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مقدس اور حضراتِ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصود اصلی احکام الٰہی کی تبلیغ تنفیذ اور اجرا ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضبِ الٰہی اور جہنم کی وعید ہے اور میدان جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے، قرآن میں ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۚ وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۱۵۔۱۶)

''اے اہل ایمان! جب میدانِ جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمتِ عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے، ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔''

﴿ وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

[1] حافظ رحمہ اللہ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہیے، جب کہ وہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکامِ الٰہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہیے۔

''اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔''

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد وقتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامتِ دین، تنفیذِ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت وخلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور ضیغوں سے متعلق ہے، عام عبادات واعمالِ صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامتِ دین کی راہ میں خونِ شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہر وقت جہاد وقتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے:

﴿ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۵)

''تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے، میں ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) اللہ کے ہاں سے بدلہ ہے اور اللہ کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔''

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، ان میں سے ایک معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت، تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورۂ نور میں ہے:

﴿ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ ﴾ (۲۴/ النور:۲)

''اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آئے۔''

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکامِ الٰہی کی تنفیذ واجرا سے ہے، اسی طرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں:

﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۳)

''اور ان سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔''

صرف حکم الٰہی کی اطاعت کو ''دین'' فرمایا گیا ہے، سورۂ انفال کی اس آیت میں:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ (۸/ الانفال:۳۹)

''اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔''

بھی حکم وقانون الٰہی کی تسلیم واطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے

لائق ہے اور نہ عبادت کے، اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ ﴿ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ﴾ (٦/ الانعام:٥٧ و ١٢/ یوسف:٤٠) ﴿ أَلَا لَهُ الْحُكْمُ ﴾ (٦/ الانعام:٦٢) ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا ﴾ (١٦/ النحل:٥٢)

''اور اسی اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔''

یہاں بھی دین کے معنی احکام الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظم قرآنی کے مطابق ہے۔

سلطنت وملکیت کی حقیقت

اب دین کی تشریح کے بعد حکومت وسلطنت و لایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت وسلطنت کو عیش وتنعم کے ایوانِ زرنگار، تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال و جبروت اور قہر وہیبت کی تلواروں کے سائے میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیے

سلطنت وحکومت اور ولایت وریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت، حکومت اور بادشاہی وشہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے، مگر تعلیمِ محمدی ﷺ نے ان سب لفظوں سے جو جبر وقہر اور ظلم وستم کے مظہر تھے، پرہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اس لیے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

﴿ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلٰهِ النَّاسِ ۝ ﴾ (١١٤/ الناس:١-٣)

''کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی۔''

﴿ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلٰمُ ﴾ (٥٩/ الحشر:٢٣)

''بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) امن وامان والا۔''

﴿ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ﴾ (٢٣/ المؤمنون:١١٦)

''تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔''

﴿الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾ (٦٢/ الجمعة:١)

''بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا ہے۔''

یہ آیت قرآن پاک میں چھ دفعہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو ''الملک الحق'' یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس ''لوگوں کا بادشاہ'' کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس ''لوگوں کا پالن ہار'' بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو، دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا، تاکہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے، تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے، چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفت آئی ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم و سفاکی، قہر و جبر اور بے رحمی و سخت دلی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لیے اس لفظ کا استعمال کیا ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضروری لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت

عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہِ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے، اسلام میں شاہِ شاہاں، شہنشاہ، ملک الملوک صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، آنحضرت ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا:

((اخنع الاسماء عندالله رجل تسمى ملك الاملاك)) [1]

''سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔''

معانی جن الفاظ سے ادا کیے جاتے ہیں، اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرزِ حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے، خلیفہ عربی زبان میں قائمقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرمانروا نہیں، بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائمقام ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائمقام ہے؟

---

[1] صحيح بخاري، كتاب الادب، باب ابغض الاسماء الى الله: ٦٢٠٦۔

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں، تورات میں یہ بیان صرف آدم علیہ السلام کے آغازِ پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے، لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلّف ہونا، اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزاوسزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض، احکامِ الٰہی کی بجا آوری کی صورت اور اللہ کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں۔ [1]

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳۰)

''اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

یہ خلیفہ حضرت آدم علیہ السلام تھے، جو بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے، اس لیے دوسرے موقعوں پر آدم علیہ السلام کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۷۰)

''ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔''

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدم علیہ السلام بنی آدم کے قائم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغہ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

﴿ اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳۸)

''تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ راہنمائی آئے تو جو میری راہنمائی کی پیروی کریں گے، تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔''

سورۂ اعراف میں ارشاد الٰہی ہے:

[1] خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے، یہ مضمون آج بھی پیشِ نظر رکھنے کے قابل ہے۔

﴿ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ڰ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۰۔۱۱)

''اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمھارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے، کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔''

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی، اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی، وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی، سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰۗىِٕفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ڮ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۱۶۵)

''اور وہی (اللہ) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا، تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے بے شک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بے شبہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا جانشین، بنایا:

﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ ﴾ (۷/ الاعراف:۶۹)

''اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوح علیہ السلام کے بعد جانشینی بخشی۔''

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا:

﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ ﴾ (۷/ الاعراف:۷۴)

''اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد نیابت بخشی۔''

حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

﴿ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ ﴾ (۱۱/ ھود:۵۷)

''تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔''

حضور انور ﷺ کی زبان مبارک سے ارشاد ہے:

﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴾

(٦/ الانعام:١٣٣)

''اور اللہ چاہے گا تو تم کو لے جائے گا اور تمہارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔''

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ (٢٤/ النور:٥٥)

''اللہ نے تم میں سے ان سے، جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا۔ جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔''

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ﴾ (٦/ الانعام:١٦٥)

''اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں جانشین بنایا۔''

سورۂ یونس میں تصریح ہے:

﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (١٠/ يونس:١٣ـ١٤)

''اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو، جب انہوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے ہم گناہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا، تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔''

اس کے بعد نوح علیہ السلام کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

﴿ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ ﴾ (١٠/ يونس:٧٣)

''لیکن ان لوگوں نے ان (نوح علیہ السلام) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح علیہ السلام) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو طوفان سے بچالیا اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنادیا۔''

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۭ ﴾

(۳۵/ فاطر:۳۹)

''وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کو خلافت بخشی گئی:

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾

(۳۸/ ص:۲٦)

''اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے، تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔''

یہ لفظ خلیفہ خلف سے مشتق ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیبوبت کے سبب سے ہو، آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ ﴾ (۱۹/ مریم:۵۹)

''تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔''

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا:

﴿ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ ﴾ (۷/ الاعراف:۱٤۲)

''میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔''

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

﴿ وَلَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰۗىِٕكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ ﴾ (۴۳/ الزخرف:٦۰)

''اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔''

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے، بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے

جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النيابة عن الغير اما لغيبة المنوب عنه و اما لموته واما لعجزه واما لتشريف المستخلف. [1]

''خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں۔ اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو یا اس کی موت کے سبب سے ہو یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو، یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کے لیے ہو۔''

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی زادہ صاحب روح المعانی تک ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے، تینوں معنی کے لیے مختلف قول نقل کیے ہیں اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہییں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے، وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اس کی جانشینی مراد ہو گی اور جہاں تصریح نہیں ہے، وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ (۵۷/ الحدید:۷)

''اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے۔''

اب اس آیت میں ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لیے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں، کچھ نے کہا: ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے، کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امورِ خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں، کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے۔ کشاف میں ہے:

ان الاموال التي في ايديكم انما هي اموال الله بخلقه وانشاء ه لها وانما مولكم

[1] مفردات، امام راغب اصفہانی، ص: ۱۵۵۔

ایاھا وخولکم للاستمتاع بھا وجعلکم خلفاء فی التصرف فیھا۔ ❶

''وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے (درحقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے، کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے، اسی نے تمہارے تمتع کے لیے اس کا تم کو مالک بنایا ہے اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔''

بیضاوی میں ہے:

من الاموال التی جعلکم اللہ خلفاء فی التصرف فیھا۔ ❷

''وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔''

روح المعانی میں ہے:

جعلکم سبحانہ خلفاء عنہ عز و جل فی التصرف فیہ من غیر ان تملکوہ حقیقۃً۔ ❸

''اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے، نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل ونائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو اس باب کا سرِ عنوان ہے، یعنی:

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ﴾ (۲/ البقرۃ:۳۰)

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً مِنِّیْ یَخْلُفُنِیْ فِی الْحُکْمِ بَیْنَ خَلْقِیْ۔

''میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا، میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں۔''

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

---

❶ تفسیر سورۃ حدید، ج۲، ص: ۱٤٤٨۔ ❷ تفسیر بیضاوی، ج۲، ص: ۳٤۷۔

❸ روح المعانی، ج۲۷، ص: ۱٤٦۔

ان اللّٰہ تعالٰی اخبر الملٰئکۃ انّہٗ جاعل فی الارض خلیفۃ لہ یحکم فیھا بین خلقہٖ بحکمہٖ. ❶

''اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔''

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

والمراد بہ آدم علیہ السلام لانہ کان خلیفۃ اللّٰہ تعالٰی فی ارضہٖ وکذلک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض و سیاسۃ الناس وتکمیل نفوسھم وتنفیذ امرہٖ فیھم لالحاجۃ بہ تعالٰی الٰی من ینوبہ بل لقصور المستخلف علیہ عن قبول فیضہ وتلقی امرہ بغیر وسط. ❷

''اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں، اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔''

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گزری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفا فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے توسط سے اس خلافتِ الٰہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں:

① تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

② روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا، اس لحاظ سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن جس اہتمام سے، جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش، اللہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ، پھر ان کی عدولِ حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلہ انبیا قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات وفضائل جو بیان کیے گئے ہیں، ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا، یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گزشتہ مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی تھی۔

③ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول ممہد کیا گیا ہے اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی، اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا

❶ تفسیر طبری، ج۱، ص:۱۵٤۔ ❷ تفسیر بیضاوی، ج۱، ص:٤٤۔

وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی، جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا، اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق وسباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی اور اگر اس توضیح سے کلام کلیتہً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے، اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے، جس کا آدم علیہ السلام کو نائب بنانا سمجھا جائے، ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا مقصود ہو جائے گا۔

④ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں، جس سے آدم علیہ السلام اور بنی آدم کے شرف وکرامت کا اظہار ہوتا ہے، فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾ (١٧/ بنی اسرآءیل:٧٠)

''ہم نے آدم علیہ السلام کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ (٩٥/ التين:٤)

''ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔''

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے، سب اس کے لیے بنا ہے اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (٤٥/ الجاثية:١٣)

''اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں، جو سوچتے ہیں۔''

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں، بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقات الٰہی کو انسان کا تابع دار اور مسخر اور اسی کے لیے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے، مزید تشریح کے لیے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں:

﴿ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ (٢/ البقرة:٢٩)

''اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔''

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ ﴾ (١٦/ النحل:١٤)

''اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمہارے) اختیار میں کیا۔''

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ ﴾ (٤٥/ الجاثية:١٢)

''اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا۔''

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٣٢)

''اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کر دیا۔''

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٣٢)

''اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔''

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے اور یہی خلافتِ الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٧٢)

''ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔''

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابت الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے، یہ امانت الٰہی کیا ہے؟ یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے، نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے، جو اس کو ملی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لیے عاریت ملے ہیں، یہ حدیث کہ ((فان اللّٰه خلق اٰدم علی صورته)) [1] ''اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔'' اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول ((تخلقوا باخلاق اللّٰه)) ''اللہ کے اخلاق سے متصف ہو۔'' کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریہ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے، جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے اور جس کے اندر مادی و روحانی، سیاسی اور اخلاقی، دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں۔

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتا دی

[1] صحیح مسلم، کتاب البر و الصلة، باب النهي عن ضرب الوجه:٦٦٥٥۔

ہے، ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ ﴾ (٥١/ الذاریات:٥٦)

''میں نے انسان اور جن کو اسی لیے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں۔''

اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے، جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعتِ الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

اُمّتِ مسلمہ کی بعثت

عقیدۂ خلافت کی رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابتِ الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہلِ سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمائندے تو انبیا علیہم السلام ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے لیے خاتم الانبیا ہو کر تشریف لائے ہیں اور آپ ﷺ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے، تو امت محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں نیابتِ الٰہی کی نمائندہ ہے اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمائندہ رہے گی، اسی لیے قرآن پاک اور احادیثِ نبوی ﷺ میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو آخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی پچھلوں کے ہیں:

﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۝ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ۝ ﴾ (٥٦/ الواقعة:١٣۔١٤)

''ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں سے۔''

﴿ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ﴾ (٦٢/ الجمعة:٣)

''اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کہ کوئی نیا نبی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ ''انبیا کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انہوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انہوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا شرف بخشا تو انہوں نے مغرب تک کام کر کے انجام تک پہنچا دیا اور پوری مزدوری پائی۔'' [1] یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری و ترمذی و موطا و حاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے۔ [2]

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ امتِ مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے، صحیح بخاری و مسلم و نسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے:

((نحن الآخرون السابقون)) [3]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب من ادرك ركعة من العصر: ٥٥٨۔

[2] کنز العمال، ج٦، ص:٢٣٠۔

[3] صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب النفخ فی المنام: ٧٠٣٦۔

”ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے۔“

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں، لیکن اجر و ثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے، حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم، بیہقی اور نسائی میں بھی ہے۔ [1]

ابن ماجہ میں ہے نبی ﷺ نے فرمایا:

((نحن آخر الامم)) [2]

”ہم سب سے آخری امت ہیں۔“

غرض ان آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امتِ محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے، کیونکہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے، اس لیے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و منصور رہے گا، جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگا تا رہے گا اور اہل عذر کی حجت کا قاطع ہو گا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآنِ پاک قیامت تک محفوظ رہے گا، اب ظاہر ہے کہ اس کی حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو پورا کر دے گا، گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے، مگر عالمِ تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لیے اسباب و علل کا واسطہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا، اس کے بعد پورا فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کی حفاظت کا جو وعدہ مایا ہے تو وہ بھی اسباب و تدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہو گا، اسی لیے قرآنِ پاک کی بقائے دوام کے لیے حاملینِ قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا اور انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہو گا، جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِۦ يَعْدِلُونَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۸۱)

”ہمارے مخلوق بندوں سے ایک امت ہے جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے (اور کرتی رہے گی)۔“

---

[1] كنز العمال، ج ٦، ص: ٢٣٠۔ [2] ابن ماجه، كتاب الزهد: ٤٢٩٠۔

اہلِ تفسیر نے اس کو امتِ محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و مستقبل دونوں کے لیے ہے، یعنی قیامت تک امتِ محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا۔ ❶

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴾ (۳/ ال عمران:۵۵)

''اور تمہارے پیروؤں کو تمہارے نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں، گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں، اسی طرح ان کے اصلی پیرو تو مسلمان ہیں، ❷ مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کہے جا سکتے ہیں، گو گمراہ ہوں، ❸ بہر حال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں مبتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلبہ عام حاصل ہو جائے، جیسا کہ نزول مسیح علیہ السلام کی حدیثوں کا منشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان اشارات النص کی تصریح احادیث نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے:

((لا تزال من امتي امة قائمة بامر الله لا يضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتى يأتيهم امر الله وهم على ذلك)) ❹

''میری امت کا ایک گروہ اللہ کی شریعت کو لے کر قائم رہے گا، اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت آ جائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔''

((لايزال ناس من امتي ظاهرين حتى يأتيهم امر الله وهم ظاهرون)) ❺

''میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ کی بات یعنی قیامت آ جائے گی۔''

((لا يزال من امتي قوم ظاهرين على الناس حتى يأتيهم امر الله)) ❻

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔''

((لا يزال من امتي امة قائمة بامر الله لايضرهم من كذبهم ولا من خذلهم

---

❶ تفسیر بغوی، ص: ۳۶۷ وتفسیر خازن تفسیر آیت مذکورہ، ج۲، ص:۲۶۳۔ ❷ تفسیر ابن جریر تفسیر آیت مذکورہ، ج۳، ص: ۱۸۵، ۱۸۶۔ ❸ تفسیر روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ، ج۳، ص: ۱۶۲۔

❹ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ:۳۶۴۱۔ ❺ ایضًا:۳۶۴۰۔

❻ ایضًا، کتاب التوحید:۷۴۵۹۔

حتی یأتی امر اللّٰہ وھم علی ذلك)) [1]

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الٰہی کو لے کر قائم رہے گا اس کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔''

((لا تزال طائفة من امتی ظاھرین علی الحق لا یضرھم من خذلھم حتی یأتیھم امر اللّٰہ وھم کذلك)) [2]

''میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔''

((لن یبرح ھذا الدین قائمًا یقاتل علیه عصابة من المسلمین حتی تقوم الساعة)) [3]

''یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا اس کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔''

((لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاھرین الٰی یوم القیامة)) [4]

''میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے گا اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔''

((لا تزال طائفة من امتی قائمة بامر اللّٰہ لا یضرھم من خذلھم او خالفھم حتی یأتی امر اللّٰہ وھم ظاھرون علی الناس)) [5]

''میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکامِ الٰہی کو لے کر قائم رہیں گے، ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔''

((ولا تزال عصابة من المسلمین یقاتلون علی الحق ظاھرین علی من ناواھم الٰی یوم القیامة)) [6]

''مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔''

((لا تزال عصابة من امتی یقاتلون علی امر اللّٰہ قاھرین لعدو ھم لا یضرھم من خالفھم حتی یأتیھم الساعة وھم علی ذلك)) [7]

''میری امت کی ایک جماعت اللہ کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباتی

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷٤٦۰۔ [2] مسلم کی تمام روایتیں صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب قوله ﷺ: ((لاتزال طائفة من امتی ظاھرین علی الحق)): ٤٩٥۰۔ [3] ایضًا: ٤٩٥٣۔ [4] ایضًا: ٤٩٥٤۔ [5] ایضًا: ٤٩٥٥۔ [6] ایضًا: ٤٩٥٦۔ [7] ایضًا: ٤٩٥٧۔

رہے گی، اس کے مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔''

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابو داؤد، ابن ماجہ، ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں۔ [1] اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے ہماری تسکین کی خاطر کے لیے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرما دی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک قائم رہے گا، تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آیندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی اور یہ فرض جو پہلے انبیا علیہم السلام کے ذریعہ عطا ہوتا تھا، وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی ایک حدیث ہے: ((العلماء ورثة الانبياء)) [2] یعنی امت محمدی کے علماء انبیا کے وارث ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں شامل نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین علیہ السلام کی ذات اقدس پر ختم ہوگیا، بلکہ نبوت کے فضائل و کمالات و فرائض سے ان کے حسب استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا اور وہ تبلیغ دین، ہدایتِ خلق، دعوتِ حق، اقامتِ دین، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دفعِ شبہات، ابطالِ مبطلین اور ردِ بدعات وغیرہ ہیں اور وہ یہی کام انجام دیں گے۔

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضورِ انور ﷺ کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی، تو یہ امتیں بیک زبان امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی۔

كادت هذه الامة ان تكون انبياء كلها. [3]

''قریب ہے کہ اس امت کے سارے افراد انبیا کا مرتبہ پائیں۔''

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شهداء على الامة یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام صلوٰۃ اللہ علیہم کو حاصل ہوا، اسی طرح اس امت کو شهداء على الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امت محمدیہ سے لیا جائے گا۔'' [4] یہ شاید اس لیے ہوگا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے:

---

[1] دیکھیے كنز العمال، ج ٦، ص: ٢٣١، ٢٣٥۔ [2] یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعددہ مروی ہے اور محدثین نے اس لیے اس کو معتبر مانا ہے دیکھیے المقاصد الحسنة سخاوی، ص: ١٣٥ و كشف الخفاء عجلونی، ج ٢، ص: ٦٤۔ یہ حدیث شعب الايمان بيهقی: ١٦٥١؛ صحيح ابن حبان: ٨٨؛ مسند الشهاب: ٩٠٨؛ احمد، ٥/ ١٩٦۔ [3] مسند طيالسی، ج ١، ص ٣٥٤، عن ابن عباس ومسند احمد وابو يعلى۔ [4] حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں ﴿لتكونوا شهداء على الناس﴾ کی تفسیر میں ان روایتوں کو یک جا کر دیا ہے۔ ج ١، ١٩٠، ١٩١۔

''اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، ان میں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٦٠)

''مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا، یا مجھ سے مانگو میں دعا قبول کروں گا۔''

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیا کو حاصل تھا اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (٢٢/ الحج:٧٨)

''اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔''

اور یہ بھی صرف انبیا کو کہا گیا تھا اور تیسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ (٢/ البقرة:١٤٣)

''ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز امت بنایا، تا کہ تم لوگوں پر شاہد ہو۔''

یہ بھی پہلے صرف نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو۔ [1] اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں امت محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ امت محمدیہ کو شهادة علی الناس اور شهادة علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے۔

''شہید اور شاہد'' کے لغوی معنیٰ ''حاضر'' کے ہیں، کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہوسکتا ہے، مثلاً: اس کی حمایت اور مدد کے لیے، اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لیے اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے، اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعویٰ کی تائید کے لیے، اس کو امورِ خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لیے، اسی لیے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان ثانوی معنوں میں حسب سیاق و سباق بولا جاتا ہے، جس کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا:

① حمایتی اور مددگار کے معنی میں:

﴿ وَادْعُوا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ ﴾ (٢/ البقرة:٢٣)

''اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلاؤ (کہ قرآن کا جواب لائیں)۔''

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

﴿ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴾ (١٧/ بنی اسرآءیل :٨٨)

''اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔''

② ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں:

---

[1] تفسیر فتح البیان میں نواب صدیق حسن خان نے اس روایت کا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔ دیکھئے، ج ۱، ص:۱۹۴۔

﴿ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۷)

''اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔''

ان معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں۔

③ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

﴿ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۷)

''(حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر، جب تک ان میں رہا، نگران رہا۔''

④ گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴾

(۴/ النسآء:۴۱)

''بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔''

⑤ امور خیر کی تعلیم، یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے کے معنی میں:

﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۳)

''اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔''

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۱۰)

''قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئی، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔''

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے، اس لیے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے، وہ نبی کے دعویٰ کی شاہد، حمایتی، مددگار اور گواہ ہے، وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا کہ دینِ الٰہی کامل ہو چکا پیغامِ الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امت محمدیہ

کے سپرد ہو گیا ہے، اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمہ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظام عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے۔ رسول علیہ السلام اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا و امام ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیا کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہو گی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام بلائے جائیں گے، وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے: ہاں میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا انہوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے کہ ہمیں تو کوئی ڈر سنانے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام سے پوچھے گا، تمہارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے محمد ﷺ اور ان کی امت، تو یہ نوح علیہ السلام کی شہادت دیں گے۔'' یہ ارشاد فرما کر حضورِ انور ﷺ نے یہ آیت پڑھی ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ الخ ''یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا، تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔'' [1]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یہاں مثالاً ہے، ورنہ امتِ محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہو گی، اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت ہے جو تمام انبیا علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جزو ہے، یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے، قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہو گا۔

سورۂ حج میں سورۂ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے:

﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ﴾ (۲۲/ الحج:۷۸)

''اسی اللہ نے (اے امت محمدیہ ﷺ) تم کو (ساری امتوں) میں چنا ہے اور اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی، تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین، اسی نے تمہارا نام مسلم پہلے رکھا اور اس قرآن میں بھی، تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔''

اوپر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں، اُمَّةً وَّسَطًا، ''عادل و معتدل امت''

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ البقرۃ: ٤٤٨٧۔

خَیْرَ اُمَّۃٍ ''سب سے بہتر امت'' ھُوَ اجْتَبٰکُمْ ''تم کو اللہ نے چنا ہے'' یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی، برتری اور فضیلت پر شاہد ہیں، بلکہ وصف اجتباکم ''تم کو چنا اور برگزیدہ کیا'' تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیا علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، جو قیامت تک کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لیے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں، وہ نبی ﷺ کی امت دعوت ہیں، حضورِ انور ﷺ نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو انجام دیا، آپ ﷺ کے بعد عہد بعہد قیامت تک اس پیغامِ الٰہی کی دعوت وتبلیغ امتِ محمدیہ کا فرض قرار پایا، جب تک دنیا آباد ہے، ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغام الٰہی کی دعوت وتبلیغ تا بہ قیامت امتِ محمدیہ کا فریضہ ہے، یہی بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امت محمدیہ کی بعثت ہے، جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے حسب ذیل فرمائی ہے:

''تمام انبیا علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے جو دوسری قوموں کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے، تو اس نبی کی بعثتِ اولیٰ اس کی بعثتِ ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔'' [1]

شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام وتعلیمات وآداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لے کر جو اس کو پہنچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے:

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ (٦٢/ الجمعة:٢)

''وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی کے اندر سے بھیجا۔''

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ (٣/ آل عمران:١١٠)

''قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو۔''

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

---

[1] حجة الله البالغة، باب حقيقة النبوة وخواصها، ج١، ص: ٦٧۔

((فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ)) [1]

''تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمد یہ ایک پیغام حق کی حامل ہے اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے، وہ اس لیے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے، حضور انور ﷺ کا حجۃ الوداع میں اخیر حکم:

((فيبلغ الشاهد الغائب)) [2]

''میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے، وہ اس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔''

صرف حضور انور ﷺ کے عہد مبارک تک کے لیے محدود نہیں، بلکہ قیامت تک کے لیے یہ جاری و ساری ہے، فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے، ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے:

﴿ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۲۲)

''تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے، تاکہ دین کا علم سیکھتے اور اس میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے، تاکہ وہ حذر کرتے۔''

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی:

اور یہی منشا اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گزر چکی ہے، جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۱۰)

''قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے، بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لیے سرفروشی کرے اور اسی لیے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

[1] صحيح بخاری، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ: ((يسروا ولا تعسروا)): ٦١٢٨ وحجة الله البالغة، ج ١، ص: ٦٧۔ [2] صحيح بخاری، کتاب العلم: ١٠٤ ومسلم، کتاب الحج: ٣٣٠٤۔

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۰۴)

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ امتِ محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی، جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کی آغوش میں اپنا اپنا خون لے کر آئیں اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہیں، لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہوگئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہوگیا، مگر انشاء اللہ یہ وعدہ الٰہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آ کر اس فرض کو ادا کرے گی:

﴿ إِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۗ ﴾

(۹/ التوبة:۳۹)

''اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا (جو اللہ کے پورے فرماں بردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔''

پھر فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهُ ۙ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۚ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ ﴾ (۵/ المآئدة:۵٤)

''اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی، اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہارِ حق میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے گی۔ اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورۂ حج کے آخری آیتوں میں ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۩ ﴾

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۷_۷۸)

''مومنو! رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تا کہ فلاح پاؤ اور اللہ کی (راہ) میں جہاد کرو، جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمہارے لیے) تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین (پسند کیا) اسی سے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے) تا کہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو، وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔''

ان آیتوں سے اس شاہد امم اور مجتبائے عالم امت کے حسب ذیل آثار و علامات ہیں:

1. ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی۔
2. ادائے زکوٰۃ پر عامل۔
3. ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط۔
4. رکوع و سجود و عباداتِ الٰہی کی خوگر۔
5. امورِ خیر پر حریص۔
6. راہِ حق میں جہاد اور فداکاری پر آمادہ رہنے والی۔

امتِ محمدیہ کے جس گروہ میں یہ علامات پائی جائیں گی، وہی ان شاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہوگا، اس کی بقا اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ

کسی جماعت کو منظّم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لیے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لیے ایک قوتِ عاملہ یا قوت آمرہ کی ضرورت فطرت انسانی کا تقاضا ہے، اسی لیے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے، کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جاسکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو، انسانی گروہ جب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا، جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا، پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا، ان بادشاہوں اور راجاؤں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت گزاری کا صلہ سمجھنے کے لیے اپنے غرور واستکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھا یا مافوق بشر قویٰ سے اپنے کو متصف قرار دیا، اس خیال کا لازمی نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا، جن کی پوجا ان کی رعایا پر فرض تھی، ان میں سے کوئی سورج بنسی بنا اور کوئی چندر بنسی، یعنی کوئی سورج دیوتا کا نور نظر تھا اور کوئی چاند کا ٹکڑا اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوتِ ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے اور مصر کے فرعون اپنے کو رَعْ یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے تھے، ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ ''میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا'' بننے کا دعویٰ کیا تھا، چین کے بادشاہ اپنے کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، اسی لیے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بغپور (اللہ کا بیٹا) اور عربوں نے ابن ماء السماء (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو اللہ کا اوتار کہتے تھے، ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے۔ [1] اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے، یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا اللہ ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

روما کا بانی رولس اور اس کا بھائی دونوں ستارہ مریخ کی اولاد تھے۔ [2] ولادتِ مسیح علیہ السلام کے پہلے سے سلاطین روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ [3] یہودیوں میں حضرت داوٗد علیہ السلام سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو اللہ کے کاہن اور اللہ سے الہام پاکر اللہ کے نام پر حکومت کرتے تھے، اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہیں، ان ہی سب کے پیشِ نظر اربابِ تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں، مثلاً اوتاری، شخصی، زعیمی، امرائی، دستوری، جمہوری۔

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم، مضمون یونان۔ [2] تاریخ روما، ص:۳۰، دار الترجمہ حیدر آباد دکن۔ [3] ایضاً، ص:۴۲۹۔

① اوتاری سے مفہوم تھیا کریسی ہے، یعنی وہ حکومت جس میں صاحب حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود اللہ یا اللہ کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

② شخصی وہ حکومت ہے جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت واثر سے حکومت کرتا ہو اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو، دنیا میں اکثر بادشاہ ایسے ہی گزرے ہیں۔

③ اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد مل کر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے، جیسی کبھی یونان میں تھی۔

④ اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دے کر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کر دے تو یہ حکومت دستوری ہے، جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

⑤ زعیمی (آمرانہ) وہ طرزِ حکومت ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمائندے کی حیثیت سے ملک پر حکمران ہوتا ہے، مثلاً: جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی، گو وہ بادشاہ نہیں تھے، مگر ان کا حکم بادشاہ ہی کے طور پر مانا جاتا تھا، فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمائندہ تھے۔

⑥ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لیے کسی مدت معینہ کے لیے اپنا ایک رئیس منتخب کر لیں، جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے، اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے۔ اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے، فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے، جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے، انگلستان میں حکومت کی ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیر اعظم پر ہوتی ہے اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سیکرٹری ہوتے ہیں، اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریہ اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف انجمنوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔

اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امراض کے لیے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کیے ہیں۔

اسلام کے طرزِ حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے، اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سیاسیین یورپ نے اسلامی خلافت کو

مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا، پرانے علما جو شخصی سلطنتوں کے خوگر ہیں، اس کو شخصی بتاتے ہیں، نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا، پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا، پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈکٹیٹر شپ) قوت پکڑ رہی ہے اس کو زعیمی حکومت (ڈکٹیٹر شپ) ثابت کرنے کے لیے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں بیک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری اور زعیمی حکومتوں کی خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اس لیے اہلِ نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے وہ نہ اوتاری ہے، نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح و مثالب سے خالی ہے، اس لیے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی، کبھی زعیمی، کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط و خال کا جائزہ لیجیے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے، مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ اللہ ہے، نہ اللہ کا اوتار ہے، نہ اللہ کا مظہر ہے، نہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے، نہ اللہ سے براہِ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی الٰہی تقدیس ہے، نہ وہ اللہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور اللہ کی شریعت کی تنفیذ کے لیے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول ﷺ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جاسکتا ہے اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں اربابِ شوریٰ اور اہلِ حل و عقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افرادِ امت کے جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کے لیے ضروری ہے، اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جاسکتا ہے، لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہلِ سیاست کے بنائے ہوئے

نظریاتِ حکومت میں سے ایک نظریہ بھی اسلامی طریقِ حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آ سکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، اربابِ شوریٰ کی ترتیب اور تعیین ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہارِ رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور ان کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جزو کسی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ اللہ کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے اور اللہ کے بنائے ہوئے اور تعلیم کیے ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے اور سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہے کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے، تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں، عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لیے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف اللہ کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کی کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عہدِ نبوت، زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عمل صالح کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے، جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جا رہی ہے اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے، اسی طرح اس اسلامی نظامِ حکومت کی برقراری کے لیے بھی سب سے پہلے اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کے اجرا کی حاجت ہے۔

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل
حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (۱۲/ یوسف:۴۰)

''حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔''

آیت بالا میں ارشاد خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے، اس لیے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن احکام الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی، یعنی وہ احکام جو انبیا علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں اور دوسرے تکوینی، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقات عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری وساری ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گزرے ہیں، جنہوں نے نمرود وفرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا، مگر ان کو بھی تکوینی احکام الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی اور یہ شبہ ان سلاطین عالم کو اس لیے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام و فرامین کے آگے جب اللہ کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک وشبہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ، فیصلہ ہے، اسی معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (۱۲/ یوسف:۶۷)

''حکم نہیں، مگر اللہ کا۔''

﴿أَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ﴾ (۶/ الانعام:۶۲)

''ہاں، اسی کے لیے حکم کرنا ہے اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔''

﴿وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (۲۸/ القصص:۷۰)

''اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

امر تکوینی وفطری میں تو انسان کی ناچاری ومجبوری ظاہر ہے، وہ زمین، آسمان اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی وبیشی بھی نہیں کرسکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ ان کی صفات میں تغیر کرسکتا ہے اور نہ ان کے قواعد وقوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کرسکتا ہے، خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور ناچار ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کردیا۔ فرمایا:

﴿ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۵۸)

''تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لاجواب ہو گیا۔''

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں:

﴿ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ ﴾ (۳/ آل عمران:۲۶)

''اے اللہ سلطنت کے مالک تو ہے جس کو چاہے سلطنت دے۔''

اس لیے راہ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکامِ تکوینی کی طرح اس کے احکامِ تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں، اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجرا اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرما دیے ہیں، ان کے تتبع سے اہلِ علم اور مجتہدینِ دین نئے نئے احکامِ جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں۔

ان احکامِ الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر پر مشتمل ہوں، بے شبہ اہل عقل اپنی عقل و فہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے، یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب مترتب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اہل عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ حکم الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں، مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے اس لیے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں، جس کو اللہ عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے، عام طور سے فقہا نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے:

﴿ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ﴾ (۶/ الانعام:۵۷ و ۱۲/ یوسف:۶۷)

''حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔''

﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ﴾ (۷/ الاعراف: ۵۵)

''ہاں اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔''

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادثِ عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے، سورۂ انعام اور سورۂ یوسف میں، سورۂ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے:

﴿ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ۝ ﴾

(۶/ الانعام:۵۷)

''جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلا دیتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔''

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے، جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے، مگر ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے:

﴿ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ ﴾ (۱۲/ یوسف:۶۷)

''اور اللہ کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔''

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۫ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف:۵۵)

''بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا کیا، ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ

بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔''

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق وتکوین سے ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لفظ امر اور حکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امورِ تشریعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں، لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے، لیکن اس کے احکام کی مثل اللہ کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

﴿ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ ﴾ (۱۹/ مریم:٤٤)

''شیطان کی عبادت نہ کر۔''

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ ﴾ (۳٦/ یٰسٓ:٦٠)

''یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔''

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیا اور ائمہ زمانہ اور خلفا کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہوسکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، لیکن دوسروں کی اطاعت احکامِ الٰہی کی تبلیغ اجرا اور تنفیذ کے لیے حکم الٰہی کے تحت ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:٥٩)

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔''

اولوالامر کی اطاعت، خواہ اس سے مراد علما ہوں یا حکام، اللہ کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجرا میں ہے اور رسول کی اطاعت بھی احکامِ الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:٨٠)

''جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ﴾ (٤/ النسآء:٦٤)

''اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

یہود اور نصاریٰ نے احکام الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا اور ان کا حکم حکم الٰہی سے ماخوذ و مستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾ (۹/ التوبة:۲۹)

''اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، اس کو حرام مانتے ہیں اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔''

ان آیات میں اہل کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے، وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبہ انہوں نے اللہ کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ ﴾ (۹/ التوبة:۳۱)

''انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے اور مریم کے بیٹے مسیح کو حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔''

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً طور پر اللہ کا حکم تسلیم کرتے تھے، کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے اہل کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی:

﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ ﴾ (۳/ آل عمران:٦٤)

''اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مانی ہوئی ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک اللہ کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔''

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدی بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورۂ توبہ والی آیت مذکور پڑھی تو عدی نے کہا: ''وہ ان کو معبود نہیں بناتے، فرمایا کیوں نہیں، انہوں نے ان کے لیے

حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انہوں نے ان کے احکام کو مانا، یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے، الفاظ یہ ہیں "فَذَالِكَ عِبَادَتُهُمْ اِيَاهُمْ۔" [1] ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے، یہی تو شرک ہے۔" [2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں، بلکہ اللہ کا ہے اور اسی کا نام وضعِ حکم ہے، اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے، اسی طرح اللہ کے علاوہ یا اللہ کے حکم کے ساتھ بلا وساطتِ حکم الٰہی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانون الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، یا ان کے فیصلہ کے لیے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے، زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا، چنانچہ بعض اصولی احکامِ عدل و انصاف اور طریقِ اطاعتِ احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ﴾ (٤/ النسآء: ٦٠)

"کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا، ایمان لا چکے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔"

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے "کل معبود من دون اللّٰه" اور اہل تفسیر نے شان نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں، جادوگروں اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے، اس لیے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے، وہ طاغوت ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ (٥/ المآئدۃ: ٤٧)

"اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔"

---

[1] تفسیر ابن کثیر، تفسیر آیت سورۃ توبۃ، ج ٢، ص: ٣٤٨۔

[2] ترمذی، ابواب التفسیر ومن سورۃ التوبۃ: ٣٠٩٥۔

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے، حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے ہیں اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے قرآن پاک میں سورۂ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے:

﴿ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ﴾ (٦٥/ الطلاق:١)

''یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔''

﴿ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ﴾ (٦٥/ الطلاق:١)

''یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔''

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ ﴾ (٤/ النسآء:١٣۔١٤)

''یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا، اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے بڑی ذلت کی سزا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

قانون و شرع کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرلے اور بلا سند الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کرلے تو اس کا نام ''افتراء علی اللہ'' اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾

(١٦/ النحل:١١٦۔١١٧)

”اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال وحرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ، یہ (دنیا میں) چند روزہ فائدہ ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال وحرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا، بلکہ یہ بھی پیشین گوئی فرما دی کہ جو لوگ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے، مگر وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ ﷺ جو شریعتِ الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکامِ الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے اور اس حیثیت سے آپ کا ہر حکم حکمِ الٰہی ہے، لیکن حکمِ الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک چیز کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو عتابِ الٰہی آیا:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ ﴾ (٦٦/ التحريم:١)

”اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے، مگر جب آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ ﷺ کو منع فرما دیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو، امت کے لیے حکمِ الٰہی کے تحت شرع کا حکم رہتا ہے، اس قاعدہ کی بنا پر آپ ﷺ کے اس ترک سے امت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذنِ الٰہی کے بھی حقِ تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اسی لیے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعتِ الٰہی کا مبلغ اور قانونِ ربانی کا شارح اور مظہر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

﴿ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ (٩/ التوبة:٢٩)

”اور (یہود ونصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔“

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے، وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے، رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے، کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے، اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علمِ عقائد اور اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علمِ اصولِ فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیرِ بحث آیا ہے کہ واضعِ قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی

کے امرونہی سے بندوں نے فرض وواجب اور حرام وحلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۱۳۱ ۶ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انه لا حاكم سوى الله تعالى ولا حكم الا ماحكم به، و يتفرع عليه ان العقل لا يحسن ولا يقبح ولا يوجب شكر المنعم وانه لا حكم قبل ورود الشرع. [1]

"جاننا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور حکم وہی ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ برا اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔"

مقصود یہ ہے کہ احکامِ شریعت اور قانونِ شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے اور اسی کا قانون قانون ہے، اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کی رو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب یا حرام، ناجائز ومکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عتاب کا حکم عائد کیا جا سکے، نہیں ہوسکتا اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبارِ ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے۔ علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاكم لا خلاف في انه رب العالمين. [2]

"اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع پروردگارِ عالم ہے۔"

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسنوی واضح کرتے ہیں:

"حسن وقبح اور شے کے اچھے یا برے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے، جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا برا ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے اور دوسری نقص کی، جیسے علم اچھا ہے اور جہل برا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہوسکتا ہے۔ اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حسن وقبح کے یہ دونوں فیصلے شرع پر موقوف نہیں اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کرسکتی ہے اور اس فیصلہ کے لیے حکم الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت

[1] كتاب الاحكام في اصول الاحكام، ج ۱، ص:۱۳۔ [2] ج ۲، ص:۸۹ بولاق مصر۔

کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے"۔ ❶

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے اور عقل سے اس کی مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہلِ عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہلِ سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلک حق ہے، مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

"حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو برا فرمایا وہ برا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا برا ہوتا اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا۔" ❷

بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانونِ عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

"اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا اجماع ہے اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون و حاکم عقل ہے، یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں عقل بعض احکامِ الٰہی کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے"۔

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۵ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے:

"اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو، یا اس کی

❶ ج ۱، ص: ۹۰ برحاشیہ تحریر ابن ہمام۔ ❷ مسلم الثبوت، المقالۃ الثانیۃ فی الاحکام۔

دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، نہ ایمان واجب ہے اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکمِ الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔ [1]

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قولِ فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (برا) ہے تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ انصاف، امر و نہی سے پہلے ہی عالم حقیقت میں ہو چکا تھا اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں، لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورہ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں صرف شرع الٰہی پر مبنی ہیں۔'' [2]

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصول فقہ درحقیقت اصول فقہ کی تہذیب ہے [3] اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرما دیا ہے، اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ''قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے۔'' یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لیے ثابت نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے، عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پا لیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرین قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضعِ قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم، آمر اور واضعِ شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانونِ شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقت خاص میں نازل ہوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول و کلیات اور دوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیر و تبدل نہیں

[1] ارشاد الفحول، ص:۱٦۔ [2] اصول الفقه، ص:۱۲۔ [3] ''تہذیب'' منطق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے دفتر ہیں، ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے۔

ہوتا، تغیر وتبدل اور تجدد یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے، جوانہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو، لیکن اس کے اصول وکلیات پرانے اور غیر مبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں، قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لیے یوں سمجھئے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب بندوق سے، تپنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولہ سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے، لیکن ذرائعِ قتل کا تغیر نفسِ مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائیکلوں، سکوٹروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے، ان سے حادثے پیش آ جائیں، یا نقصان پہنچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہ یہ پیش آ سکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول وفروع پر پوری نظر رکھتے ہوں، آیات واحادیث سے احکام کے اصولِ کلی اور ان کے علل واسباب اور مصالح ومقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضع اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے، بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکامِ الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہلِ اصول کے اس مسئلے کے قیاس حکم کا صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزیہ فلاں اصولِ کلی کے ماتحت ہے، انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہا نے فتاویٰ کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جا سکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔

تمت





سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم